فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	نقطۂ عدل	ام حسن	8
قولِ نبیؐ	اخلاقِ حسنہ	حمیرا خالد	11
خاص مضمون	ایمان و وفا کی ساتھی	زبیر منصوری	13
نوائے شوق	رباعیات	حافظ کرناٹکی	22
	غزل	کرامت بخاری	23
	غزل	آمنہ رومیصا زاہدی	23
حقیقت و افسانہ	یہ سلسلے وفا کے	نصرت یوسف	24
	مرے ساتھ ساتھ رہا کوئی	قانتہ رابعہ	30
	وقتِ فرصت ہے کہاں	افشاں نوید	34
	فاصلے	نبیلہ شہزاد	37
	بڑائی	عالیہ شمیم	39
انتخاب	سیاہ سونا	نیلوفر اقبال	41
خفتگانِ خاک	میرے ابی میرے مربی	بنت اللہ بخش سیال	46
انشائیہ	غموں کے خمیر سے	شمیم فاطمہ	51
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	53
روداد	یادوں کے چراغ جلاؤ کہ روشنی ہو	فرحت طاہر	58
زندگی کا فن	ناکامی اچھی ہوتی ہے	غزالہ عزیز	61
نہاں خانۂ دل	کل کس نے دیکھا ہے	ذکیہ فرحت	63
	خیر کے ننھے سفیر	تزئین فیصل	65
گزرا ہوا زمانہ	سعید بن عامر	مصطفیٰ محمد طحان	71
بتول میگزین	مریم شفیق، شازیہ محمود، محمودہ شروانی، مسز نورین فاطمہ، صائمہ عبدالواحد خورشید بیگم، ذکیہ فرحت		72
منتخب کالم	آخر حرج ہی کیا ہے	انصار عباسی	76
غذا و صحت	انگوٹھا چوسنا	ام ارقم	78
گوشۂ تسنیم	وہ بھاری کلام	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام!

سردیاں دبے پاؤں لوٹ رہی ہیں اور ابرِ بہار نے ملک بھر میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ کہرے اور دھند میں لپٹی زرد زمین جیسے یکا یک جاگ اٹھی ہے، روئیدگی دنوں کا عنوان ہے تو سرخوشی راتوں کی پہچان۔ رنگ اور تازگی، خوشبو اور چاندنی، پرندے اور ہَوا، بارش اور سبزہ۔۔۔۔ جیسے سارے کومل سُر اکٹھے ہو گئے ہوں۔۔۔۔ جیسے زندگی کہیں بدصورت نہ ہو۔۔۔ جیسے بہار کا کوئی انت نہ ہو!!

ایک تو پاکستانی کرکٹ ٹیم نے عوام کو صدمے پر صدمہ دینے کی ٹھان رکھی تھی، اوپر سے نجم سیٹھی صاحب کا یہ فرمانا کہ کھلاڑیوں پر دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ وہ پرفارم نہیں کر پا رہے۔ انسان بھی اپنے دفاع میں کیسی کیسی منطق گھڑتا ہے! کیا پاکستانی ٹیم پہلی بار بین الاقوامی سطح پر کھیلی ہے؟ اور کیا بھارت کے ساتھ پہلی بار مقابلہ کر رہی ہے؟ بھارت کے ساتھ میچ کے موقع پر قوم کس طرح پل صراط پر کھڑی ہوتی ہے، یہ کس کو نہیں معلوم؟ اگر یہ کھلاڑی ورلڈ کپ کی سطح کے کھیل کا دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے تو ایسی ٹیم ہی کیوں بنائی گئی؟ کیا ماضی میں بھیجی جانے والی قومی ٹیمیں، اور جو ٹیمیں آج وہاں پر جیت رہی ہیں، اپنے اپنے عوام کی جانب سے ایسے ہی دباؤ کا سامنا نہیں کرتیں؟ کیا کھلاڑی اس بنیاد پر منتخب کیے جاتے ہیں کہ وہ اپنے محلے کی سڑک پر بہت اچھا کھیلتے ہیں؟ فراقؔ گورکھپوری کے الفاظ میں عرض ہے کہ:

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
نگاہِ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

بہرحال کرکٹ ٹیم کی کارکردگی نے لوگوں کو بہت مایوس کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک عرصے سے اچھی لیڈرشپ سے محرومی نے عالمی سطح پر جس طرح ہمارے امیج کو بگاڑ رکھا ہے، پاکستانی اب اپنی تمام توقعات کھیلوں خاص کر کرکٹ میں جیت سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ اور جب ہار کا سامنا ہو خصوصاً انڈیا کے مقابل تو مجموعی مورال پر بہت اثر پڑتا ہے۔ ساتھ کمرشل ازم کا شکار میڈیا جس طرح سنسنی خیزی پیدا کرتا ہے، اس سے کھیل کا معاملہ مبالغہ آمیز حد تک اہم بن جاتا ہے۔ مگر کرکٹ کے اربابِ اختیار کو بھی یہ ساری صورتحال ذہن میں رکھنی چاہیئے تھی تاکہ ورلڈ کپ نہ سہی، ہمارے کھلاڑی کچھ قابلِ عزت کارکردگی تو دکھاتے۔ جس طرح قومی پیمانوں پر ملکی مفادات کے سودے کرنا ہمارا شعار بن گیا ہے، بھلا کھیل کا شعبہ الگ کیسے رہتا جب کہ لوگ بھی وہی ہوں!

سینیٹ کے انتخابات میں لگنے والی ''مویشی منڈیوں'' نے ہماری بہت جگ ہنسائی کی۔ عبرت کا مقام ہے کہ کس طرح کرپشن،

وفاداریوں اور ضمیروں کے سودے اور پیسے اور منصب کی ہوس نے ہمارے بالاترین ایوانوں کو جکڑ رکھا ہے۔ وہ ایوان جہاں اٹھارہ کروڑ عوام کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور جہاں وہ لوگ بیٹھتے ہیں جو قوم کی امانتوں کے رکھوالے بنائے گئے ہیں۔ ان کی ہوسِ زر شاید حدیث کے الفاظ میں ان کی قبروں کی مٹی ہی پوری کرے گی۔ ایسے رہنماؤں کے ہوتے ہوئے ایک عام شخص کی بددیانتی کو کیسے جرم سمجھا جائے؟ بقول احمد فراز:

طعنہ زن کیوں ہے مری بے سروسامانی پر
اک نظر ڈال ذرا شہر کی ویرانی پر
کشتیِ جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فرازؔ
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر

سانحہ بلدیہ ٹاؤن جس میں ڈھائی سو سے زائد معصوم افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے، تحقیقاتی رپورٹ آنے کے بعد ایک بار پھر شدت سے موضوعِ بحث بنا رہا۔ اگر اب بھی مجرموں کو بے نقاب کر کے ان کے خلاف بے رحم کارروائی نہیں کی جاتی تو اِس وقت کے تمام اربابِ اختیار اس جرم میں برابر کے شریک سمجھے جائیں گے۔ ہم امریکہ کے حکم پر تو اپنے ہی لوگوں کے لیے قوانین سخت سے سخت تر کیے جا رہے ہیں، مگر جو لوگ امریکہ اور برطانیہ کی گود میں بیٹھ کر پاکستان میں ظلم اور دہشت گردی کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں ان کے آگے بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر حکومت کی رِٹ کا سوال کیوں نہیں اٹھایا جاتا اور انسانی حقوق کی تنظیمیں مجرموں کو سزا دینے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتیں؟

ایم کیو ایم کے رہنما الطاف حسین کی لندن سے براہِ راست ہرزہ سرائی نے سننے والوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ یہ پاکستان ہی ہے جہاں ایسے شخص کو ''لیڈر'' کہا جاتا ہے جس کا اس ملک میں وجود ہی نہ ہو اور پھر بھی جس کی بے ربط اور ناگوار گفتگو کو ایک مجمع دم سادھے گھنٹوں سنتا ہو، جو اس حالت میں تقریر کرے کہ اس کو اپنے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر اختیار رہی نہ ہو اور جس کی زبان سے کسی کی ماں بہن بیٹی کی عزت محفوظ نہ ہو۔ جس ملک میں ایسے سیاسی لیڈر رہوں اس ملک میں جمہوریت کے مستقبل پر خدشات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

دعا گو

صائمہ اسما

☆......☆......☆

ام حسن

عورت کے معاملہ میں اسلام کا

نقطۂ عدل

شہد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملئکۃ واولو العلم قائماً بالقسط لا الہ الا ھو العزیز الحکیم

''اللہ فرشتوں اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل وقسط کا قائم رکھنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

سورۂ آل عمران کی اس آیت کی تشریح وتفسیر میں مفسرین بیان کرتے ہیں کہ نظام کائنات جس خوبی و روانی سے چل رہا ہے وہ خود توحید کی دلیل ہے یعنی یہ یک رنگی اور متضادات میں موافقت اس بات کی گواہ ہے کہ اس کائنات کو چلانے والا ایک ہی ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

اور اس نظام کائنات کے ہر گوشے میں خالق نے ایک میزان رکھی ہے کوئی شے اپنے معین محور و مدار سے ایک انچ ادھر سے ادھر نہیں ہوتی۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا خالق وفاطر عدل وقسط کو پسند کرتا ہے۔

سورۂ رحمان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدٰن والسماء رفعھا ووضع المیزان الا تطغوا فی المیزان

''سورج اور ستارے سب ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ستارے اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں میزان رکھی کہ تم بھی میزان کے معاملے میں تجاوز نہ کرو۔''

اس کائنات کے سورج اور چاند، شجر وحجر، آسمان و زمین اپنی زبان حال سے ہر وقت یہ سبق دے رہے ہیں کہ جس طرح وہ اللہ کے مقرر کردہ پیمانے سے سرمو تجاوز نہیں کرتے ان کی ہر حرکت اس پیمانے سے نپی تلی ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں خدا کی میزان میں نپی تلی روش اختیار کرے اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حدود سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔ عدل وقسط کی ضد ظلم کہلاتی ہے۔

فکر عمل، قول، اخلاق، کردار غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو خالق کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کی مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر ہے اس کو نقطۂ عدل کہا جائے گا اور اگر اس نقطے سے شوشے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے تو یہ بات عدل وقسط کے منافی ہوگی۔ اس طرح اگر ایک شے اپنے اصلی فطری مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہوگئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ چونکہ اس دنیا کے خالق و مالک ہیں اس وجہ سے اس کو اس کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے۔

اللہ کی توازن پسندی صرف نظام تکوینی ہی تک محدود نہیں بلکہ افراد واقوام بھی جب اخلاق وعمل میں فساد پیدا کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک حد تک ڈھیل دینے کے بعد گرفت کر کے بگاڑ کو درست کر دیتے ہیں۔

مکافات عمل کا قانون بھی اسی قیام بالقسط کے سلسلے کی کڑی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور شریعتیں بھیجیں اور یہ اہتمام فرمایا کہ جب شریعت میں تحریفات و بدعات سے فساد پیدا ہو جائے تو مجددیت اور مصلحین اس کی اصلاح وتجدید کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگا دیں۔ اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا اور پھر سب سے بڑھ کر اس عدل وقسط کے کامل ظہور کے لیے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں میزان عدل نصب ہو گی۔ وہ تول کر بتائے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے، کون سا

نہیں، اور پھر اسی کے مطابق جزا و سزا ہوگی۔

یہ عنوان بہت وسعت رکھتا ہے مگر میرے مضمون کا تعلق معاشرے میں مرد و عورت کے مقام و کردار کے حوالے سے نقطہ عدل کی تلاش تک محدود ہے۔

اس وقت پاکستانی معاشرے میں کیفیت یہ ہے کہ کسی حد تک معاشی وجوہات کی بنا پر اور کسی حد تک سکول، کالج اور یونیورسٹی جا کر تعلیم حاصل کرنے کے اندھا دھند چلن نے ایک کثیر تعداد میں بچیوں، لڑکیوں اور خواتین کو گھر سے باہر لا کھڑا کیا ہے۔ اعلیٰ تعلیمی درسگاہیں ہوں یا بنک و دفاتر، موبائل فون کمپنیوں کے فرنچائز ہوں یا نادرا کے آفس، بڑے چھوٹے ڈیپارٹمنٹل سٹورز میں کیشیئر و سیلز گرلز ہوں یا ریستورانوں میں بیرا گیری کرتی لڑکیاں، بسوں، ہوائی جہازوں میں میزبان خواتین ہوں یا بڑے بڑے ہوٹلوں میں منعقد ہونے والی ورکشاپس یا کانفرنسوں میں شامل عورتیں۔ غرض جدھر نظر اٹھائیں عورتیں ہی عورتیں لڑکیاں ہی لڑکیاں گھر سے باہر دکھائی دیتی ہیں۔

پھر ان کے ہر جگہ پھیل جانے کے بعد آرائش و زیبائش کو دوبالا کرنے والے لوازمات ہوں یا برانڈڈ کپڑے، پرس و بیگ، جوتے وغیرہ ہوں ہر چیز کی خریداری و کھپت میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے۔ جم، ایروبکس سنٹر، بیوٹی پارلر کا جتنا پھیلاؤ و بزنس اس وقت نظر آ رہا ہے ۳۵ سال پہلے اس کا وہم و گمان نہ تھا۔ اس پر مستزاد موبائل فونز کا وسیع پیمانے پر استعمال، کیبل و میڈیا سے پیش کیے جانے والے ہوش ربا پروگرامات اور ہر کس و ناکس تک انٹرنیٹ کی پہنچ نے وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو ۷۳ سال پہلے مولانا مودودیؒ نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''پردے'' میں مغربی معاشرے کے حوالے سے بیان کی ہیں اور جن کو پڑھ کر ہماری مائیں تھرایا کرتی تھیں۔ آج مولانا کی نشاندہی کردہ تمام باتوں مثلاً ''سوسائٹی میں ہیجان انگیز شہوانی ماحول، بے حیائی و فواحش کی کثرت، خاندان اور گھر کا نظام درہم برہم ہونا، نوجوان مرد و عورتوں کا نکاح سے اعراض اور آزاد شہوت رانی کا خوگر ہونا، منع حمل اور اسقاطِ حمل سے نسلوں کا منقطع کرنا، نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا حد اعتدال سے بڑھی شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع کرنا اور برباد کرنا، حتیٰ کہ کمسن بچوں تک میں قبل از وقت صنفی میلانات ہونے اور ابتدا ہی سے ان کی دماغی و جسمانی نشوونما میں فتور پیدا ہونے'' تک وہ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ ہمارا اور ہماری اولاد کا اس سے پالا نہیں۔

آج ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا محترم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں عورت کے معاملہ میں نقطۂ عدل کو جس طرح واضح کیا ہے اس سبق کو تازہ کریں اور اپنے لائحہ عمل کو اسی روشنی میں متعین کریں۔

مولانا نے واضح طور پر بتایا کہ عورت کی حد سے زیادہ آزادی کے نتیجے میں خاندانی نظام (جو تمدن کی بنیاد ہے) منہدم ہو جاتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ شہوانیت اور عیش پرستی پوری قوم کے اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ساتھ ذہنی، جسمانی اور مادی قوتوں کا تنزل بھی لازمی طور پر رونما ہوا ہے جس کا آخری انجام ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

امریکی و مغربی معاشرت کے تین ستون:

(۱) عورتوں اور مردوں کی مساوات

(۲) عورتوں کی کسبِ معاش میں برابر شرکت

(۳) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط ہیں

آج دانستہ و نادانستہ پاکستانی معاشرہ انہی تین خطوط پر اپنی قومی و معاشرتی زندگی کو آگے بڑھا رہا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی نظام معاشرت کا نچوڑ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں اس طرح ہے۔

''نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلت، جس طرح مرد کے لیے عزت، ترقی و کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مرد رہے اور مردانہ خدمات انجام دے، اسی طرح عورت کے لیے بھی عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ عورت رہے اور زنانہ خدمات سرانجام دے۔ ایک صالح تمدن کا کام یہی ہے کہ وہ عورت کو اس کے فطری دائرہ عمل میں رکھ کر پورے انسانی حقوق دے۔ عزت و شرف عطا کرے۔ تعلیم و تربیت سے اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو چمکائے اور اسی دائرے میں اس کے لیے ترقیوں اور کامیابیوں کی راہیں کھولے۔''

اسلامی قانون معاشرت کا مقصد ضابطہ ازدواج کی حفاظت صنفی انتشار کی روک تھام اور غیر معتدل شہوانی تحریکات کا انسداد ہے۔ اسی غرض کے لیے شارع نے تین تدابیر اختیار کی ہیں:

(۱) اصلاح اخلاق

(۲) تعزیری قوانین

(۳) انسدادی تدابیر یعنی ستر وحجاب

یہ تین ستون ہیں جن پر اسلامی معاشرت کی عمارت کھڑی ہے۔

شریعت اسلام کی روح کے مطابق عورت کا مرکز اس کا گھر ہے۔ بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں سے اسے اس لیے سبکدوش کیا گیا کہ وہ سکون ووقار کے ساتھ اپنے گھروں میں رہے اور خانگی زندگی کے فرائض انجام دے۔ تاہم اگر ضرورت پیش آئے تو گھر سے باہر نکلنا بھی جائز ہے۔ لیکن نکلتے وقت پوری عصمت مآبی ملحوظ رکھی جائے، نہ لباس میں کوئی شان اور بھڑک ہونی چاہیے کہ نظروں کو ان کی طرف مائل کرے، نہ اظہار حسن کے لیے کوئی بے تابی ہو۔ نہ چال میں کوئی خاص ادا پیدا کرنی چاہیے کہ نگاہوں کو خود بخود متوجہ کر دیں۔ ایسے زیور پہن کر بھی نہ نکلیں جن کی جھنکار غیروں کے لیے سامعہ نواز ہو۔ بولنے کی ضرورت پیش آ جائے تو بولو مگر رس بھری آواز نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ ان قواعد اور حدود کو ملحوظ رکھ کر عورت اپنی حاجات کے لیے گھر سے نکل سکتی ہے۔

بقول حمیدہ بیگم مرحومہ آج کی بیٹی اور لڑکی کو دو بڑے جہاد درپیش ہیں۔ ایک تو گھریلو زندگی اختیار کرنے پر رضا مند ہو جانا اور دوسرے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے پوری طرح تیار ہو جانا۔ یہاں یہ بات بھی محلِ نظر رہے کہ بچیوں کو انجینئرنگ، مارکیٹنگ، اکاؤنٹس، سرجری، Paratrooping وغیرہ کی تعلیم دلا کر ان سے گھرداری اور بچوں کی نگہداشت کرنے جیسی ذمہ داریوں کی کہاں تک امید رکھنی چاہیے؟

اس کے ساتھ ساتھ مخلوط تعلیمی اداروں میں اپنی بیٹیوں کو بھیجنے میں کوئی قباحت نہ سمجھنے کا رویہ کس بات کا غماض ہے؟ اور یہ کراہت دن بدن کم سے کم کیوں ہو رہی ہے؟ ہمیں ان سوالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

☆......☆......☆

حمیرا خالد

اخلاق حسنہ

قرآن کے الفاظ میں حضورﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡم (القلم 4)

یوں تو خُلق کے معنی فطرت اور طبیعت کے ہیں لیکن مستعمل معنوں میں انسان کی باطنی صورت اور اس کے اوصاف خُلُق کہلاتے ہیں اور ظاہری شکل وصورت کو خَلق کہا جاتا ہے۔ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ خُلُق کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خُلُق نفس کی اس مضبوط کیفیت کا نام ہے جس کے باعث اعمال آسانی اور سہولت سے ہوتے ہیں اور ان کے کرنے کیلئے کسی سوچ بچار اور تکلیف کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعمال جو اتفاقاً صادر ہوں یا کسی وقتی جذبہ اور عارضی جوش سے ہوں وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ اور عمدہ کیوں نہ ہوں انہیں خُلُق نہیں کہا جائے گا۔ جیسے کہ کسی وقتی جوش اور ترنگ میں اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی امداد کیلئے خزانوں کے منہ کھول دے تو ہم اسے سخی نہیں کہیں گے یا جیسے کوئی وقتی جوش اور جذبہ کے تحت دشمن پر حملہ کرکے مار گرائے تو اسے بھی بہادر نہیں کہیں گے۔

اسی لئے خُلُق کا اطلاق صرف انہی عادات اور خصائل پر ہوتا ہے جو پختہ ہوں اور جن کی جڑیں قلب وروح میں خوب گہری ہوں۔

آپؐ سے پوچھا گیا کہ اکثر لوگ کسی چیز کے سبب جنت میں جائیں گے تو آپ نے فرمایا......اللہ کا تقویٰ اور حُسنِ خُلق۔

اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اکمل المئومنین ایمانا احسنھم خُلُق یعنی جس شخص کا خُلُق بہترین ہوگا تو تمام مئومنین میں اس کا ایمان اعلیٰ اور اکمل ہوگا۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص کثرت عبادت پر ناز کرتا ہو اور اخلاق حسنہ کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کم ہو۔ ایسے میں اللہ کے محبوبؐ نے بتایا کہ انسان اپنے اخلاق کے باعث اس درجہ پر فائز ہو جاتا ہے جو رات بھر ذکر الٰہی میں کھڑے رہنے والے اور عمر بھر روزہ رکھنے والے کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔

اسلام کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ اب کم از کم ان بنیادی اصول اخلاق کی لازماً پابندی کی جائے ورنہ مسلمان کہلانے کے بعد اگر اخلاق کا معیار روز بروز بہتر نہ ہوا تو یہ ایمان کے فقدان کا نہیں تو نبوت کے فیض سے محرومی کا سبب ضرور ہوگا جبکہ نبوت سے فیض کا بلند ترین مقام مکارم الاخلاق ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا۔

بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق

میں مکارم اخلاق کو مکمل کرنے کیلئے بھیجا گیا ہوں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا درجہ اور مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو دیکھو کہ تمہارے دل میں اللہ کا کیا مقام ہے اور اسی طرح اگر یہ جانچنا چاہتے ہو کہ محمد مصطفیٰ صلعم کے ہاں تمہارا کیا درجہ ہے تو دیکھ لینا چاہیے کہ ہم نے اخلاقیات نبویؐ سے کتنا حصہ پایا ہے۔ ایمان کے چار شعبے ہیں۔ ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات۔ اسلام ہمیشہ اچھے اخلاق اور اچھے معاملات سے پھیلا ہے۔ اخلاق کا تعلق خدا اور بندے سے نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان قائم ہیں۔ معاشی لین دین ہو یا سیاسی معاملات ہوں۔ سماجی برتاؤ ہو یا افراد خانہ وخاندان واحباب سے سلوک ہو۔ اسلام سب کے لئے اخلاقی اصول وضابطے دیتا ہے۔

حضور صلعم نے ایک مرتبہ لوگوں کو جمع کر کے فرمایا میرا تم لوگوں کے پاس سے چلے جانے کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ خوب سمجھ لو مجھے بہت محبوب ہو گا وہ شخص جو اپنا حق مجھ سے وصول کر لے یا معاف کر دے کہ میں اللہ جل شانہٗ کے پاس بشاشت قلب کے ساتھ جاؤں۔

پھر آپ نے ایک ایک عمل کا ذکر کیا۔

جس کا کوئی مالی مطالبہ ہو وہ میرے مال سے لے لے۔ جس کی آبرو پر حملہ کیا ہو وہ میری آبرو سے بدلہ لے لے۔ جس کی کمر پر میں نے مارا ہو تو میری کمر موجود ہے۔ اور کوئی شخص یہ شبہ نہ کرے کہ مجھ سے بدلہ لینے سے میرے دل میں بغض پیدا ہو گا۔ بغض رکھنا میری طبیعت میں ہے اور نہ میرے لئے مناسب ہے۔

اسلام کی نظر میں کچھ پسندیدہ اخلاق ہیں اور کچھ ناپسندیدہ ہیں تاکہ انسان ان سے بچ کر اپنی آخرت کی زندگی کو بہتر بنا سکے۔ اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اگر اس کے سامنے کسی شخص پر جھوٹی تہمت لگائی جا رہی ہے تو وہ خاموشی سے نہ سنے بلکہ اس کی تردید کرے۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل ہو رہی ہو یا اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ہرگز نہ کرے گا بالخصوص ایسے موقع پر جہاں وہ اللہ کی مدد کا حد درجہ ضرورتمند ہو گا۔ اور اگر ایک مسلمان کسی مسلمان کی حمایت کرتا ہے تو اللہ عزوجل اس کی مدد ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے اس کو اللہ کی مدد حاصل ہو۔ (ابوداؤد) انسان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے اس کے تمام تر اعمال اور اس کی جملہ عادات اخلاقی اوصاف سے مزین ہوں۔ زندگی کا حقیقی حسن و جمال حسن اخلاق کے سوا کچھ نہیں۔ انسان مختلف قسم کے تعلقات رکھتا ہے۔ ان میں مختلف قسم کے حقوق و فرائض ہوتے ہیں۔ ان حقوق کا ادا کرنا انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ انسان پر سب سے بڑا حق اس کے خدا کا ہے۔ خدا کے حقوق کی ادائیگی اس کی عبادت اور اطاعت میں ہے۔ خدا کے بعد اس کے بندوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا بے حد ضروری ہے۔ زندگی میں اخلاقی صفات کا پایا جانا ہدایت کی دلیل ہے۔ اسلام اخلاق حسنہ کو ایمان کی پہچان بتاتا ہے جس کے اخلاق جتنے اچھے ہوں گے اس کا ایمان اتنا زیادہ مضبوط ہو گا اور اس کی عبادت مقبول ہو گی۔ گویا ہمارے اخلاق ہماری ایمانی حالت کی کسوٹی ہیں۔ ہم اخلاق کے آئینہ میں اپنی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

(استفادہ۔ پیغمبر اخلاق، ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد)

☆......☆......☆

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ایمان ووفا کی ساتھی

گزشتہ صدیوں میں جاری رہنے والی گروہی اور فقہی بحثوں اور جھگڑوں نے امت مسلمہ کو کئی اعتبار سے نقصان پہنچایا ہے۔ یہ نقصان کیا ہے؟ یہ نقصان وحدت کا بکھر جانا ہے، مشترکہ بیانیوں (Narratives) کا گم ہو جانا ہے، لیکن یہ سب نقصانات وہ ہیں جن کو ہم کسی حد تک جانتے ہیں اور ان پر بات بھی کرتے ہیں اور اصلاح احوال کی پوری نہ سہی ادھوری کوشش بھی کرتے ہیں لیکن انہی تنازعات نے بعض دیگر نقصانات بھی پہنچائے ہیں، بعض دیگر حوالوں سے بھی ہماری اجتماعیت کو کمزور کیا ہے۔ ان میں سے ایک نقصان یہ بھی ہے کہ ہم لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر اسلامی تاریخ میں سے وہ چیزیں چن لیتے ہیں جو ہمارے اپنے مکتبہ فکر کو نمایاں کرتی ہیں۔ یعنی اسلامی تاریخ کے لئے ہماری اپروچ Elective کے بجائے Selective ہو کر رہ گئی ہے۔
اس اپروچ کے کتنے نقصانات ہیں یہ تو الگ بحث ہے لیکن سب سے المناک بات یہ ہے کہ ایسا ہونے کے باعث اسلامی تاریخ کے تابناک ترین چہرے بھی بے توجہی کا شکار نظر آنے لگتے ہیں۔ بلند و بالا قد آور شخصیات جو اسلام کے مرکزی دھارے کا حصہ ہیں وہ ہماری گفتگو، تقاریر کتابوں اور تذکرے کا حصہ نہیں رہتیں۔ بچوں کو ان کا نام تو بتایا جاتا ہے لیکن نام سے جڑے جذبوں سے آشنا نہیں کیا جاتا۔
ایسے میں نئی نسل کے لئے یہ شخصیات آہستہ آہستہ درسی کتاب کا ایک سبق بنتی جاتی ہیں جو انہوں نے چھٹی کلاس میں صفحہ 76 پر پڑھا تھا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی گزشتہ برسوں اور دہائیوں میں ایسی ہی بے توجہی میں سے حصہ ملنے لگا ہے۔ ہمارے اجتماعی تذکروں، گفتگوؤں، محفلوں اور وعظ و تلقین سے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تذکرہ ملنا گم سا گیا ہے۔
اب اگر آپ بچوں سے پوچھیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کون تھیں؟ تو وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ آپ کو ان کے بارے میں تین چار حقائق سے آگاہ کر دیں گے۔ آپ ان کے چہرے کو دیکھیں گے تو وہاں آپ کو کوئی انسیت، عقیدت یا محبت اس طرح نظر نہیں آئے گی جو ربع صدی رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں شامل رہنے والی اس خاتون رضی اللہ عنہا کا حق ہے۔
اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سب اس کمی کو محسوس کریں اور اس کا ازالہ کریں جیسے ہو سکے، جہاں ہو سکے ہم پر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہی نہیں خود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا قرض ہے۔ آیئے اپنے اس قرض کو ادا کرتے ہیں۔
امی خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی محبت اور خلوص کی خوشبو سے معطر زندگی پر یہ چند صفحات پیش خدمت ہیں۔ ان سطروں کے درمیان ہی کہیں وہ پیغامات موجود ہیں جو وہ اپنی پاکیزہ زندگی میں امت کی بیٹیوں کے عمل کیلئے چھوڑ گئی ہیں۔ اگر آپ دوران مطالعہ ان کو پالیں تو اسے اللہ کی توفیق سمجھئے گا اور ممکن ہو تو اپنی یاددہانی کے لئے آخری صفحے پر نوٹس کے طور پر لکھ لیجئے گا۔ یہ دراصل امی خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آپ کے لئے انمول تحفہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے آپ کو یہ ہیرے اور جواہرات ضرور ملیں گے۔

ذہین، باوقار، شائستہ

ایک چمکیلی صبح مکہ کی خواتین خانہ خدا کے قریب ایک جگہ جمع ہو کر خوش گپیوں میں مصروف ہیں، سب ہی خوش نظر آ رہی ہیں، مسکراہٹیں، قہقہے، شور، وہیں دوسری طرف ایک باوقار سی شخصیت کی حامل درمیانی عمر کی خاتون خانہ کعبہ کے طواف سے ابھی ابھی فارغ ہوئی ہیں وہ اپنی شخصیت سے ہی کسی بڑے خاندان کی چشم و چراغ نظر آتی ہیں۔ ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ، ذہانت اور مالی آسودگی انکے بارونق چہرے سے ظاہر ہے۔
ایسے میں ایک اجنبی وہاں نمودار ہوا، وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا، خواتین کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے بولا
"اے مکہ کی عورتو"
یہ آواز سن کر ماحول پر وقتی طور پر خاموشی چھا گئی،

وہاں موجود خواتین اس اجنبی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ان سب کو اپنی جانب متوجہ پا کر وہ شخص بولا "دیکھو میری بات سنو!"

وہ اپنی بات کی اہمیت کے پیش نظر کچھ دیر کیلیئے رکا، وہ چاہتا ہے کہ سب کی پوری توجہ اس کی جانب ہو جائے۔

اب وہ پر جوش لہجے میں وہ اہم بات انہیں بتانے لگا

"تمہارے یہاں ایک نبی آنے والا ہے، اس کا نام احمد ہو گا، تو تم میں سے جس کسی کو بھی اس سے شادی کا موقع ملے وہ بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دے۔"(1)

یہ سننا تھا کہ خواتین اسے غصے سے ڈانٹنے لگیں بھلا یہ بھی کوئی بات ہے جو بتانے کے لئے تم نے ہمارا وقت ضائع کیا؟ کسی نے اسے دیوانہ کہا، اور کسی نے سودائی اور ایک بار پھر اپنی گپ شپ میں مصروف ہو گئیں۔

وہ باوقار خاتون بھی یہ سب سن رہی تھیں۔

وہ اجنبی شخص جو دراصل ایک یہودی عالم تھا اپنی مقدس کتابوں کے علم کی بنیاد پر جو انکشاف کر گیا تھا وہ حقیقت میں انہی قابل عزت خاتون کے لئے تھا یہ طیبہ اور طاہرہ خاتون کوئی اور نہیں مکہ کی بڑی تاجرہ اور امیر ترین خاتون ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تھیں۔انہیں اللہ نے اپنے محبوب کی رفاقت کے لئے منتخب کرنا تھا اور انہیں اس عظیم ذمہ داری کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا 555ء میں مکہ کے معروف تاجر اور مرد میدان خویلد بن اسد کے گھر پیدا ہوئیں ابابیلوں کے ذریعے ابرہہ کی بربادی کے واقعے کے وقت وہ 15 برس کی تھیں اور 5 پشتوں کے بعد ان کا نسب نبی مہربان ﷺ کے ساتھ جا ملتا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والد عرب کی ایک طویل جنگ حرب فجار میں مارے گئے تو ان کی ذمہ داری ان کے چچا عمر بن سعد نے سنبھال لی ان کے قریبی عزیزوں میں حضور ﷺ کی نبوت کو پہلے پہچاننے والے ورقہ بن نوفل، حضور ﷺ کے قریبی دوست حکیم بن حزام شامل ہیں۔حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک عقل مند انسان تھے انہوں نے 120 برس کی عمر پائی جس کا نصف جاہلیت اور نصف اسلام کے سائے میں گزرا معروف صحابی زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھتیجے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دادا اسد بن عبد العزیٰ کے گھر کو خانہ کعبہ کا ''جوڑی دار'' کہا جاتا تھا وہ خانہ کعبہ سے محض 9 فٹ کے فاصلے پر تھا اور دن کے مختلف اوقات میں دونوں گھر ایک دوسرے کے سائے میں آ جاتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان لوگوں میں شامل تھیں جنہیں اللہ نے پاکیزہ دل، نرم زبان، کشادہ ہاتھ اور اجلے کردار سے نوازا تھا وہ اسلام سے پہلے ہی بتوں سے نفرت کرتی تھیں اور سچائی کی تلاش میں رہنے والے لوگوں میں شامل رہتی تھیں۔ان کی پاکدامنی اور شائستگی کی وجہ سے مکہ کے جاہل معاشرے میں جہاں عورت کی کوئی عزت نہیں تھی، وہ قریشی خواتین میں ''سیدہ'' کہلاتی تھیں انہیں ان کی حاضر جوابی اور ذہانت کے سبب ''جیدہ'' بھی کہا گیا اور ''طاہرہ'' کے لقب سے بھی نوازا گیا۔

انہوں نے اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل سے آنے والے آخری نبی ﷺ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اس نبی ﷺ کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں تذکرے ملتے تھے اور عرب میں اس کی آمد کے بارے میں گفتگو معمول کا حصہ تھی۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بھی یہ باتیں معلوم تھیں وہ بھی ان خوشخبریوں میں دلچسپی رکھتی تھیں اور ایسے کسی نبی ﷺ کی آمد کی منتظر تھیں۔ادھر اللہ اپنی مشیت سے انہیں ذہنی طور پر اپنے محبوب نبی ﷺ کی رفاقت کے لئے تیار کر رہا تھا اور اس کا ایک ذریعہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے وہ خواب تھے جنہیں بعد میں سچ ثابت ہونا تھا، ایسے ہی خوابوں میں سے ایک موقع پر انہوں نے دیکھا کہ چاند اور سورج جیسی ایک زبردست روشنی ہے جو ان کے گھر میں داخل ہو کر ان کی آغوش تک پہنچتی ہے اور پھر اس سے ساری کائنات روشن ہو جاتی ہے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں اور اپنے چچا زاد بھائی ورقہ سے اس خواب کا ذکر کیا ورقہ نے سنتے ہی مبارک سلامت کا شور مچا دیا اور بولے۔

''جلد ہی خدا تمہارے گھر کو اپنی روشنی سے منور فرمائے گا اور یہ روشنی ایک نبی کی ہوسکتی ہے وہ نبی اس دنیا میں تشریف لا چکے ہیں آپ ان پر ایمان لانے والی پہلی خاتون ہوں گی وہ نبی خاندان قریش بنو ہاشم سے ہوگا''(2)

یہ سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا، ہوتا بھی کیسے؟

خواب اب حقیقت جو بننے جا رہا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پہلے شوہر ابو ہالہ بن زرارہ تھے مگر وہ دو بیٹوں ہند اور ہالہ کی پیدائش کے بعد جلد ہی فوت ہوگئے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ کا نکاح ثانی عتیق ابن آلہ سے ہوا جو بنو مخزوم میں سے تھے ان سے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک بیٹی ہند پیدا ہوئیں پھر ایک دن آیا جب وہ بھی دنیا سے منہ موڑ گئے اور اب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں اور یتیم بچوں پر مشتمل گھر، انہوں نے اولاد کی تربیت کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا اور آئندہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا، روایات کے مطابق ان کی باوقار شخصیت اور معاشرتی حیثیت کی وجہ سے کئی معززین حتیٰ کہ ابوجہل نے بھی رشتے کا پیغام بھیجا مگر سیدہ طاہرہ کیلئے تو رب نے ایک عظیم اعزاز کا انتظام کر رکھا تھا اس لئے انہوں نے ان رشتوں سے انکار کر دیا یہی وجہ ہے کہ جب ان کا نکاح نبی مہربان ﷺ کے ساتھ ہوا تو ابوجہل نے جل کر کہا کہ

''اسے قریش کے یتیم کے سوا کوئی اور نہیں ملا؟''(3)

تاجرہ، طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

دمشق کی طرف قافلہ تجارت کی روانگی کا مرحلہ تھا

مکہ کے تاجر تیاریوں میں مصروف تھے، سامان تجارت اور اسے لے جانے کیلیے ٹیمیں، افراد تیار کیے جا رہے تھے سب ہی اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے اور جلد ہی قافلے نے تین ماہ طویل سفر کا آغاز کرنا تھا گرمیوں اور سردیوں کے موسموں میں ان تجارتی قافلوں کے کاروباری سفر پر ہی دراصل مکہ کی آبادی کے بڑے حصے کا انحصار تھا ایسے میں مکہ کی تجارت کے ایک بڑے حصے کی تنہا مالکن (4) حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تیاری میں مصروف تھیں کیوں کہ خاتون ہونے کے ناطے وہ اپنے تجارت کے سامان کو خود دمشق نہیں لے جا سکتی تھیں اس لیے انہوں نے مکہ میں رائج طریقہ کار کے مطابق اپنے ملازمین کے ذریعے اعلان کروا دیا کہ انہیں ایک قابل اعتماد منتظم (بزنس منیجر) چاہیے جو ان کا سامان لے کر جائے اور سلیقے سے بیچے اس کام کے لیے انہوں نے دو اونٹ معاوضے میں دینے کا اعلان کیا۔ اس پیشکش نے کئی لوگوں کو متوجہ کر دیا ان میں قریشی نوجوان محمد ﷺ کے چچا ابو طالب بھی تھے اس وقت تک محمد ﷺ طے شدہ معاوضے کے بدلے لوگوں کی بکریوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ابو طالب نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ یہ ایک قیمتی موقع ہے میرا دل تو نہیں چاہتا کہ تمہیں خود سے جدا کر کے ایک طویل سفر پر بھیجوں مگر یہ مالی حالات بہتر بنانے اور کاروباری تجربات کا ایک اچھا موقع ہے۔

ابو طالب چاہ رہے تھے کہ محمد ﷺ خود جا کر خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اپنے لیے بات کریں مگر اس موقع پر محمد ﷺ کی پھوپی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بھابھی حضرت عاتکہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہا زوجہ عوام بن خویلد بولیں یہ کچھ مناسب نہیں کہ محمد ﷺ خود جا کر بات کریں۔ چنانچہ ابو طالب پیارے یتیم بھتیجے کے مستقبل کے لیے خود حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بات کرنے نکل کھڑے ہوئے، گئے تو وہ کاروبار کے سلسلے میں محمد ﷺ کے لئے بات کرنے لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ فیصلہ محمد ﷺ کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب لانے جا رہا ہے، قدرت اپنی حکمت سے اس ہستی کو تجارت کے تجربات سے گزارنا چاہتی ہے اور پھر اسے ایک باوقار بیوی کا تحفہ دے کر اس کی زندگی میں خوشیاں بھرنا چاہتی ہے۔

ابو طالب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچتے ہیں اور ان کے سامنے آمنہ کے لعل ﷺ کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی امانت و دیانت کا ذکر کرتے ہیں جن سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا خود بھی آگاہ تھیں یہاں ابو طالب اپنے بھتیجے کی خوبیوں کے پیش نظر ان کے لیے دو نہیں چار اونٹوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تو گویا گوہر مقصود ملنے جا رہا تھا وہ خوشی سے اسے قبول کر لیتی ہیں بلکہ کہتی ہیں کہ:

''ابوطالب تم نے ایک آسان معاوضے کا مطالبہ کر دیا اللہ کی قسم اگر تم اس سے کہیں زیادہ کا سوال کرتے تو میں وہ بھی تمہیں دے دیتی'' (5)

بنو اسد قبیلے کی بکریوں کی دیکھ بھال کرنے والا نوجوان جسے کل رہتی دنیا تک اربوں انسانوں کو رہنمائی فراہم کرنا اور انہیں جنت کی منزل تک پہنچانا تھا اب تاجر بننے جا رہا تھا، دمشق کا طویل سفر اسے درپیش تھا، اب قدرت اس کی کچھ نئی تربیت کرنا چاہتی تھی، انسانوں اور ان کے مزاج و معاملات کو سمجھنا، روپے پیسے کا حساب کرنا، کاروبار کو سمجھنا، بھاؤ تاؤ، لوگوں سے میل جول، مارکیٹ کی صورتحال سمجھ کر درست فیصلے اور پھر ان سب کے ساتھ ساتھ امانت و دیانت کے اصولوں کو کس طرح مدنظر رکھنا ہے؟ کس طرح کسی کو کاروباری نقصان پہنچائے بغیر اپنا فائدہ حاصل کرنا ہے، کس طرح آپس کے تعلقات کو متاثر کیے بغیر معاملہ کرنا ہے، اللہ اپنے ہونے والے نبی ﷺ کو دنیا میں کاروبار کے اصول سکھانا چاہتا تھا اور زندگی میں سفر کی اہمیت سے بھی آشنا کرانا چاہتا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اس بے داغ کردار کے نوجوان کی پہلے ہی تعریف سن چکی تھیں اب وہ اس کی کاروباری معاملہ فہمی اور کردار کی خوبیاں پرکھنا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے غلام میسرہ کو محمد ﷺ کے معاون مگر دراصل اپنے نمائندے کے طور پر ان کے ساتھ کر دیا تا کہ انہیں محمد ﷺ کے کاروباری طریقہ کار اور انداز کا پتا چل سکے۔

اب میسرہ آپ ﷺ کے ساتھ تھا وہ راستے میں پیش آنے والے منظر دیکھ رہا تھا کہ کس طرح راستے میں بادلوں نے سایہ کیے رکھا، کس طرح سوکھے ہوئے درخت ہرے بھرے ہو گئے، ہفتہ دس دن نہیں وہ پورے تین ماہ کے اس سفر میں ساتھ ساتھ رہا اس نے محمد ﷺ کی شخصیت اور معاملات میں وہ خوبیاں دیکھیں جو اس نے زندگی میں کبھی کسی دوسرے انسان میں نہ دیکھی تھیں۔ اس نے آپ ﷺ کا کردار دیکھا اور جھوٹے بتوں کی قسمیں کھا کر مال بیچنے سے بچتا ہوا پایا۔ اس نے نسطور راہب کو دیکھا، جو آپ ﷺ کو پہچان کر آپ ﷺ کے قدموں میں گر گیا آپ ﷺ کی پیشانی پر محبت اور احترام سے بوسہ دیا اور کہا تھا کہ

''آپ ﷺ ہی وہ شخص ہیں جن کے بارے میں تورات میں گواہی دی گئی تھی''

ادھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا منتظر تھیں کہ قافلہ واپس لوٹے وہ آپ ﷺ کی غیر معمولی شخصیت سے تو متاثر ہو چکی تھیں اب میسرہ سے ان کی تصدیق چاہتی تھیں۔

جب میسرہ نے مکہ پہنچ کر پوری تفصیل سے آپ ﷺ کی شخصیت کے پہلو انہیں بتائے تو وہ آپ ﷺ کے کردار عظمت اور خوبیوں کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکیں اور جب انہوں نے یہ باتیں اپنے استاد ورقہ کے سامنے بیان کیں تو وہ بھی بول اٹھے۔

''یہی آخری نبی ہیں جن کا ان کی قوم انتظار کر رہی ہے'' (6)

اب خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تردد کی کوئی وجہ باقی نہیں بچی تھی اور وہ دل کی گہرائیوں سے اس نتیجے پر پہنچ چکی تھیں کہ یہ ہستی جلد شرف و اعزاز کی بلندیاں پانے والی ہے۔ انہوں نے اعتراف کر لیا کہ یہی وہ شخص ہے جو ان کی روح کا ساتھی بن سکتا ہے، جو ان کی زندگی میں مسرتوں اور خوشیوں کا سفیر بن کر داخل ہو سکتا ہے، ان کے یتیم بچوں کا سرپرست بن سکتا ہے، اور اس طرح بنے گا کہ پھر یہ بچے اسے اپنا سب کچھ سمجھ لیں گے۔ وہ محمد ﷺ کی شخصیت کے سامنے سر تسلیم خم کر چکی تھیں۔

زندگی کا نیا سفر شروع ہوتا ہے

دمشق سے واپسی کو دو ماہ ہو چکے تھے

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو محمد ﷺ کی ذات میں بس نفع ہی نفع نظر آ رہا تھا وہ مکہ کی کامیاب اور امیر ترین خاتون تھیں، اچھا گھر، اچھی زندگی، بچے سب کچھ انہیں حاصل تھا مگر انہیں اپنے غلام میسرہ اور استاد ورقہ سے جو کچھ سننے کو ملا تھا اور جو روشن خواب وہ دیکھتی رہی تھیں جب وہ ان سب باتوں کو آپس میں جوڑ کر دیکھتی تھیں تو ان سارے نکتوں سے ایک ہی تصویر بنتی نظر آتی تھی۔

اور وہ تصویر خوبصورت، خوب سیرت، محمد ﷺ کی تھی یہ تصویر جو پہلے ان کی نظر میں کچھ دھندلی تھی اب واضح ہو چکی تھی، انہیں اب یقین ہو چکا تھا کہ محمد ﷺ ہی وہی ہستی ہیں جن کی رفاقت سے بڑا اعزاز دنیا و آخرت میں کوئی نہیں۔

ایسے میں انہوں نے اپنے دل کی بات اپنی پیاری سہیلی نفیسہ سے کر ڈالی وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے احساسات فوراً سمجھ گئیں۔ اور انہوں نے اس معاملے میں اپنا کردار ادا کرنے کا یقین دلایا

کیا خوبصورت بات تھی!

دل جو دراصل اللہ رب العزت کی دو انگلیوں کے درمیان ہے اس پر بھلا کس کا اختیار؟ مگر دل کے احساسات کے اظہار کا راستہ اور طریقہ اتنا خوبصورت اور اتنا پاکیزہ کہ دل خوش ہو جائے۔ ایسا نہیں کہ جو معاشرہ کا چلن تھا اسی کو اختیار کر لیا! دل کی بات کرنے کا انداز اتنا عمدہ، پاکیزہ اور درست تھا کہ رہتی دنیا کے لئے مثال بن گیا اور یہی نہیں بلکہ یہ بات بھی کہ اردگرد موجود نفیسہ جیسی مخلص اور محبت کرنے والی سہیلی فوراً معاملات کو ٹھیک طریقے سے حل کی طرف بڑھانے کے لئے تیار، سبحان اللہ۔

قابل اعتماد سہیلی مناسب وقت کی تلاش میں تھیں

نفیسہ ایک دن موقع پا کر محمدﷺ کو شادی کی طرف متوجہ کرتی ہیں ،محمدﷺ اپنے کمزور معاشی حالات کا ذکر کرتے ہیں ایسے میں وہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جانب متوجہ کرتی ہیں۔

بات یہاں سے شروع ہو کر بڑوں اور بزرگوں کی طرف جاتی ہے۔ محمدﷺ اور خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں ہی یتیم ہیں۔ اس لئے دونوں طرف سے ان کے چچا یعنی محمدﷺ کی طرف سے ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے عمرو بن سعد شادی کی بات چیت آگے بڑھاتے ہیں۔ اور بالآخر خوشیوں کا وہ لمحہ آن پہنچتا ہے، دور دور تک دعوتیں دی جاتی ہیں حتی کہ دائی حلیمہ بھی شادی میں شرکت کرتی ہیں اور اس شادی سے بے حد خوش خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے 40 بھیڑوں کے ریوڑ کا تحفہ پاتی ہیں۔

شادی کی تقریب کا اہتمام ہوا اونٹ اور بھیڑیں ذبح کی گئیں۔ خوشیاں منائی گئیں اور خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رخصت ہو کر محمدﷺ کے گھر یعنی ابو طالب کے گھر آ جاتی ہیں، 25 برس کے محمدﷺ اور 40 برس کی خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا باہمی محبت اور خلوص کے ایک ایسے سفر کا آغاز کرتے ہیں جس نے اب کبھی ختم نہیں ہونا، دنیا کے بعد رب کی جنتوں میں بھی جاری رہنا اور ایک دوسرے کی رفاقت سے خوشیاں پانی ہیں۔ اگرچہ عمروں میں بڑا واضح فرق ہے لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے محمدﷺ کو کبھی ذہنی، نفسیاتی، اور جذباتی سطح پر یہ فرق محسوس نہیں ہونے دیا۔

چند دنوں بعد محمدﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر منتقل ہو جاتے ہیں اس موقع پر وہ اپنا سب کچھ آپﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتی ہیں اور اپنے آپ کو آپﷺ کی خدمت کے لئے وقف کر لیتی ہیں۔ انہیں محبت کرنے والی بیویوں کی طرح آپﷺ کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرنا اچھا لگتا ہے، وہ ان کی ساری ضرورتوں کا خیال خود رکھتی ہیں، اپنے عزیز از جہاں شوہر کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتیں، انھیں محمدﷺ کو معمولی سی تکلیف پہنچنا بھی گوارہ نہ تھی۔

ازدواجی زندگی کے اس سفر میں یتیم بچے بھی ساتھ ہیں اور نبی مہربانﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ، زید رضی اللہ عنہ بھی منہ بولے بیٹے کے طور پر موجود ہیں اور ام ایمن رضی اللہ عنہا بھی (جنہیں حضورﷺ محبت سے ''دوسری ماں'' کہتے تھے) موجود ہیں۔ وقت گزرتا ہے اسی کاشانہ نبوت میں قاسم، عبداللہ، ام کلثوم، رقیہ، زینب، فاطمہ بھی آنکھ کھولتے ہیں اور یوں یہ گھرانہ مکمل ہوتا چلا جاتا ہے۔

پاکیزہ شوہر اور بیوی کتنی اچھی زندگی گذار رہے تھے ذرا ابو طالب کے غلام کی زبانی سنیے

شادی کے بعد شفیق چچا ابو طالب ایک دن اسے بھیجتے ہیں کہ ذرا دیکھ کر آؤ میرے پیارے محمدﷺ کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہو رہا ہے؟

واپسی پر وہ ایسے خوب صورت لفظوں میں منظر کشی کرتے ہیں کہ ابو طالب کا دل خوشی سے بھر جاتا ہے

انہیں اپنے بھتیجے کی قسمت پر رشک آنے لگتا ہے

غلام نباء کہتا ہے کہ

"خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب محمدﷺ کو گھر میں آتے دیکھا تو سارے کام چھوڑ کر دروازے پر ان کا استقبال کیا آگے بڑھ کر محبت سے ان کے ہاتھ تھام کر انہیں اندر لائیں اور بولیں

"میں آپﷺ کے سوا کسی اور کے لیے یہ سب کچھ کبھی نہ کرتی کیونکہ آپﷺ ہی وہ پیغمبر ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا ہے آپﷺ جب اس مقام تک پہنچ جائیں تو مجھے اپنے دل سے بھلا نہ دیجیے گا اور میرے لیے اللہ سے دعا کیجیے گا۔(7)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے محبت وعقیدت میں ڈوبے الفاظ سن

کر نبی مہربان ﷺ فرماتے ہیں

''خدا کی قسم اگر میں وہی شخص ہوں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی آپ کو نہ بھلاؤں گا آپ نے میری خاطر بہت قربانیاں دی ہیں۔''

کیا ہی خوبصورت عمل ہے!

ایک اطاعت شعار بیوی کی کیا ہی خوبصورت خواہش ہے!

میرے نبی مہربان ﷺ کا؟ اور خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیٹیوں کے لئے کتنا پیارا سبق ہے کہ گھر میں داخل ہونے والے شوہر کا استقبال کیسے کرنا ہے؟ کیسے اچھے جملوں سے اس کی توجہ حاصل کرنی ہے، اور کس طرح ہر موقع کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور تعلق کی مضبوطی کا ذریعہ بنالینا ہے۔ وقت گزرا اور تاریخ گواہ بن گئی کہ آپ ﷺ نے خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آخری سانس تک اپنی محبتوں کا مرکز بنائے رکھا۔

سعیدہ فی قلب مصطفیٰ ﷺ

ابن حجر، فتح الباری میں ایک عجیب واقعہ نقل کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے مشرکین کے اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس (نعوذ باللہ) فرشتہ نہیں شیطان آتا ہے آپ ﷺ سے عرض کی جب حضرت جبرائیل تشریف لائیں تو ذرا مجھے بھی بتائیے گا۔

چنانچہ جب روح القدس تشریف لائے تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ وہ اس وقت میرے ساتھ ہیں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس موقع پر نبی ﷺ سے ایک عجیب درخواست کردی کہ آپ میرے گھٹنے پر بیٹھ جائیں آپ ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اتنی محبت تھی کہ آپ ﷺ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے تھے چنانچہ ایسا کرنے پر آمادہ ہو گئے اب خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ اس وقت بھی جبرائیل کو دیکھ رہے ہیں؟؟ حضور اقدس ﷺ نے جواب دیا کہ ہاں تو آپ نے انہیں دوسرے گھٹنے پر بٹھالیا پھر پوچھا اب؟؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں!! آپ نے رسول ﷺ کو اپنے اور قریب کرلیا پھر پوچھا کہ کیا اب بھی جبرائیل نظر آ رہے ہیں؟؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنھا نے سر سے چادر اتار دی اور نبی مہربان ﷺ کو اپنے اور قریب کرلیا پھر پوچھا کہ کیا اب بھی؟؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، اب نظر نہیں آرہے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا خوشی سے بول اٹھیں۔

''آپ ﷺ کو خوشیوں کی نوید ہو، میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ کوئی شیطان نہیں بلکہ ایک فرشتہ ہے اگر کوئی شیطان ہوتا تو کبھی شرم محسوس کر کے چلا نہ جاتا'' (8)

اللہ اکبر نبی مہربان ﷺ کی اپنی اہلیہ سے محبت دیکھیے!! آپ ﷺ ان کا دل رکھنے کے لیے ان کے کہنے پر جو چاہتی تھیں ویسا ہی کرتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

کیا کوئی اُن جیسا ہو سکتا ہے؟ میرے نبی ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں اور اماں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس لمحے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے مگر اب دیر ہو چکی ہے نبی مہربان ﷺ کا دل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی محبت سے لبریز ہے اور آپ ﷺ کی زبان مبارک ان کی تعریف کیے چلی جاتی ہے آواز میں محبت، خلوص، احسان مندی اور اعترافِ وفا کی مٹھاس گھلی ہوئی ہے۔ آپ ﷺ اپنے لفظوں میں مزید زور پیدا فرما دیتے ہیں۔

''خدا کی قسم''

اللہ کا نبی جب قسم کھاتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس قسم کی سچائی پر قسم کھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی محبت کے سارے رنگ اس قسم میں سمٹ آتے ہیں۔ آپ اماں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''خدا کی قسم اس نے مجھے کوئی ایسا مہرباں عطا نہیں کیا جیسے خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں''

کیا خوبصورتی ہے!

کیا جلال ہے!

کیا جمال ہے! ان لفظوں کا

اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اعزاز کیلئے بھلا اور کون کس پیرائے میں اس سے زیادہ خوبصورت اور میٹھی بات کہہ سکتا تھا؟

یہی نہیں آپ ﷺ مزید فرماتے ہیں۔

''جب لوگوں نے میرا انکار کیا انہوں نے مجھ پر یقین کیا۔ جب لوگوں نے مجھ پر جھوٹ بولنے کا بہتان لگایا انہوں نے میری تصدیق کی۔ جب لوگوں نے مجھے محروم کیا انہوں نے اپنی جائیداد سے میری مدد کی اور خدا نے مجھے ان کے ذریعے اولاد عطا کی''

آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شان میں رطب اللسان تھے ان کا ایک ایک عمل گنوا رہے تھے اور اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے ادا کئے ہوئے جملوں کی سختی کا احساس ہوگیا، وہ افسردہ تھیں کہ آخر انہوں نے کیوں کہہ دیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ایک بوڑھی عورت کے لئے اس قدر توجہ کیوں؟ مگر اب انہیں خوب اندازہ ہوگیا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا کیا عظیم مقام ہے اور اللہ خود بھی زبان رسالت سے اس عظیم خاتون کا مقام اور مرتبہ قیامت تک کے لئے واضح کردینا چاہتا تھا وہ عظیم ہستی جس نے میرے نبی ﷺ کی پہلی محبت کا اعزاز پایا تھا

سب سے پہلی بیوی تھیں
سب سے پہلے، پہلی وحی کو انہوں نے سنا تھا
سب سے پہلے ایمان لائی تھیں،
سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے وضو کا طریقہ سیکھا تھا
سب سے پہلے نماز سیکھی تھی
سب سے پہلے باجماعت نماز پڑھی تھی
میرے نبی ﷺ کے پہلے بیٹے اور بیٹی کی ماں بنی تھیں

ان ڈھیروں اعزازات کے ساتھ وہ آخر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبوب کیوں نہ ہوتیں؟ (9)

میرے نبی ﷺ کی نظر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفاداری اور غم گساری اتنی عزیز تھی کہ آپ ﷺ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے رشتہ داروں اور سہیلیوں تک کا خیال رکھتے اور ان کی عزت کرتے تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ اپنا تشریف فرما ہونے کا گدا اور تکیہ تک ان کو دے دیتے اور پوچھے جانے پر فرماتے۔

''میں بھی ان سے محبت کرتا ہوں جن سے خدیجہ (رضی اللہ عنہا) محبت کرتی تھیں''

اماں عائشہ رضی اللہ عنہا نبی مہربان ﷺ کی اپنی عزیز بیوی سے اتنی محبت پر رشک کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ میں کبھی ان سے نہیں ملی تھی مگر مجھے نبی مہربان ﷺ کی کسی دوسری عورت سے محبت پر اتنا رشک نہیں آتا جتنا حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر آتا تھا۔ وہ اکثر ان کا تذکرہ کرتے تھے اور ان کو اتنا اونچا مقام دیتے تھے کہ جب کبھی وہ بھیڑ کی قربانی کر کے حصے تقسیم کرتے تھے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سہیلیوں کو حصہ بھجواتے تھے۔

☆..........☆..........☆

ان قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟

نبی مہربان ﷺ اور صحابہ اس سوال پر غور کر رہے ہیں۔

غزوہ بدر کے قیدی اپنے مستقبل کے فیصلے کے منتظر ہیں ایسے میں ایک تھیلا لا کر نبی مہربان ﷺ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور کہنے والا کہتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کی پیاری بیٹی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھجوایا ہے اس میں داماد رسول ﷺ ابوالعاص کا فدیہ موجود ہے۔

اللہ کے نبی ﷺ وہ تھیلا کھولتے ہیں اور پھر فضا اداس ہو جاتی ہے

تھیلے میں سے ایک ہار نکل آتا ہے!

یہ تو وہی ہار ہے جو محبوب ﷺ خدا کی محبوب بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بڑے چاؤ سے اپنے گلے سے اتار کر اپنی بیٹی زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کی شادی کے موقع پر پہنا کر اپنے گھر سے رخصت کیا تھا۔ آج پیاری بیٹی نے پیاری ماں کا وہی ہار اپنے پیارے شوہر کی رہائی کیلئے اپنے پیارے والد ہی کو بھجوا دیا تھا اور میرے نبی مہربان ﷺ کی وہ ساری یادیں تازہ ہوگئی تھیں جو بیٹی کی رخصتی کے دن سے وابستہ تھیں،

برسوں محبتوں کا مرکز رہنے والی بیٹی جب گھر کی دہلیز سے رخصت ہونے لگتی ہے تو ماں باپ کی کیفیت کو الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں آج یہ ساری یادیں پھر تازہ ہوچکی تھیں اس خاموش جذباتی فضا میں نبی مہربان ﷺ کے الفاظ گونجے۔

''اگر آپ لوگوں کی رضا ہو تو زینب (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے قیدی کو آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ ان کا مال انہیں لوٹا سکے۔''

آپ ﷺ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

بھلا یہ ممکن ہی کس طرح تھا کہ میرے نبی ﷺ کی بات کو ان کے صحابہ ٹال دیں؟

چنانچہ ابو العاص اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وہ ہار ہاتھ میں اور نبی مہربان ﷺ کا احسان دل میں لے کر مکہ روانہ ہو گئے ۔ آج اس ہار نے ان کو بچا لیا تھا اور انہوں نے مکہ جاتے ہی نبی مہربان ﷺ کی صاحبزادی کو مدینہ روانہ کر دیا اور پھر کچھ عرصہ بعد خود بھی مشرف با اسلام ہوئے اور مدینہ آ گئے ۔

نبی ﷺ کی اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا سے محبت نے آج برسوں بعد پھر ثابت کر دیا تھا کہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اور ماہ و سال چاہے کتنے ہی بیت گئے ہوں آپ ﷺ کا دل اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا کی پرخلوص وفاؤں کا آج بھی پہلے کی طرح ہی معترف تھا۔

اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی مہربان ﷺ کے دل کو کچھ اس طرح اپنی محبت سے بھر لیا تھا کہ آپ ﷺ نے ایک بار پہلے آسمان اور پھر زمین کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا

''حضرت مریمؑ جنت کی بہترین خاتون اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زمین پر بہترین خاتون ہیں'' (10)

آپ ﷺ نے بہت محبت سے اماں خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دنیا میں آنے والی چار بہترین خواتین میں بھی شامل فرمایا۔ اماں خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دنیا میں اس حال میں رہیں کہ ان کے شوہر ﷺ کبھی ان سے ناراض نہ ہوئے۔ سیرت کی کتابیں ایسے کسی واقعے کے بیان سے قاصر ہیں جس میں صاحب حسب ونسب و مال حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کسی عمل سے نبی مہربان ﷺ کی دل آزاری کا کوئی معمولی سا حوالہ بھی موجود ہو۔

امت کی بیٹیوں کے لئے ان کے 25 سال پر پھیلے کردار میں کتنا خوبصورت سبق موجود ہے۔

اللہ ان سے راضی ہو گیا۔

<u>حوالہ جات</u>

1. عبدہ یمنی ،ام المومنین خدیجہ بنت خویلد سیدہ فی قلب مصطفیٰ ﷺ صفحہ 26
2. زرقانی شرح مواحب
3. رسول ﷺ کی حکمت انقلاب، اسعد گیلانی
4. زہری طبقات الکبری ، 1 / 156 صبہانی دلائل النبو 1 / 178
5. بخاری 4/ 1894
6. ابن اسحاق احبار مکہ 5/ 2006
7. صفحہ 68 ابن حجر فتح الباری
8. طبرانی معجم 23/ 11 ضحجانی سیار العالم النابلہ 2/ 112
9. ہسیامی متن 9/ 218
10. بخاری متن 1/ 4 (3)

(جاری ہے)

☆......☆......☆

حافظ کرناٹکی

رباعیات

نبیوںؑ کو بھی ولیوںؒ کو بھی پالا ماں نے ــــ سانچے میں انہیں زیست کے ڈھالا ماں نے
اس دہر کی نفرت بھری تاریکی میں ــــ پھیلایا محبت کا اُجالا ماں نے

قطرے کو سمندر کی سی وسعت بخشی ــــ بچپن کو توانائی دی قوّت بخشی
ماں دودھ ترا اپنی رگوں میں ہے رواں ــــ سانسوں کو ترے خوں نے حرارت بخشی

ماں اپنا لہو ہم کو پلایا تونے ــــ یوں جینے کا احساس دلایا تونے
گود اپنے لئے بن گئی تیری ، مکتب ــــ جس میں ہمیں دن رات پڑھایا تونے

پروان چڑھے ہیں تری آغوش میں ہم ــــ انسان بنے ہیں تری آغوش میں ہم
مہکایا ہے ہم سب کو تری ممتا نے ــــ گُل بن کے کھلے ہیں تری آغوش میں ہم

کب ہم سے ادا ہوگا اس احساں کا بدل ــــ ماں کی کسی اک شام پریشاں کا بدل
قدرت کی گراں قدر امانت ہے ماں ــــ دنیا کی کوئی چیز نہیں ماں کا بدل

نغمات کی رانی تری لوری ہے ماں ــــ بچپن کی نشانی تری لوری ہے ماں
صدیوں سے تسلسل نہیں ٹوٹا جس کا ــــ اک ایسی کہانی تری لوری ہے ماں

ماں باپ بہرحال شجر جیسے ہیں ــــ صدیوں کی دعاؤں کے اثر جیسے ہیں
جو ان کے علاوہ ہیں وہ رشتے حافظؔ ــــ ساحل سے تو لگتے ہیں بھنور جیسے ہیں

ماں باپ کا دل توڑ رہے ہیں بچے ــــ خدمت سے جو منہ موڑ رہے ہیں بچے
بچپن سے جوانی میں قدم رکھتے ہیں ــــ زن کے لئے گھر چھوڑ رہے ہیں بچے

بچوں سے ادا ہو نہ سکا دودھ کا قرض ــــ ماؤں نے مگر بخش دیا دودھ کا قرض
جیتے جی بھی اور موت کے عالم تک بھی ــــ ہر حال میں واجب ہی رہا دودھ کا قرض

غزل

جہاں اندر جہاں رکھا ہوا ہے
مگر مجھ سے نہاں رکھا ہوا ہے
ملاقاتیں مسلسل ہوں تو کیسے
زمانہ درمیاں رکھا ہوا ہے
بہار آئی چمن میں چپکے چپکے
کہیں خوفِ خزاں رکھا ہوا ہے
روانی دل کے دریا میں کہاں تھی
محبت نے رواں رکھا ہوا ہے
میں تنہائی میں تنہا تو نہیں ہوں
قفس کو رازداں رکھا ہوا ہے
غزل میں تو روایت در روایت
خیالِ رفتگاں رکھا ہوا ہے
ہے گھر میں اس قدر سامانِ نفرت
جہاں دیکھو وہاں رکھا ہوا ہے
مرا دل میرے پہلو میں نہیں ہے
اگر ہے تو کہاں رکھا ہوا ہے
خلا میں میری آہوں کے علاوہ
سکوتِ جاوداں رکھا ہوا ہے
عزا خانۂ خلوت میں کرامتؔ
غمِ آئندگاں رکھا ہوا ہے

کرامت بخاری

غزل

(1)

تیری نگاہ شوق میں پہلے سی شوخیاں نہیں
میری بساط عشق میں پہلے سی گر میاں نہیں
پھیکا سا پڑ گیا ہے کچھ رنگِ مزاجِ یار بھی
اور ہمارے ہاتھ میں رنگوں کی کہکشاں نہیں
ان پہ جو تھا وہ اعتبار ، اور وہ قرارِ پُر بہار
کھویا جو ایک بار تو ڈھونڈا کہاں کہاں نہیں
تاروں کی روشنی کو ہے ظلمتِ شب سے کیوں گلہ
دن میں تو ان کا حسن کچھ ویسے بھی ضوفشاں نہیں
لائے تھے جانِ مستعار ، مانگے کی تھی خزاں بہار
رہتی ہوں مدتوں سے میں، پر یہ میرا جہاں نہیں

(2)

ایک دل ہے تو یہ سو طرح کے افسانے ہیں
کبھی پاگل ، کبھی شاعر کبھی دیوانے ہیں
ان کو ہے عرضِ تمنّا میں کمی کا شکوہ
وہ جو سب جان کے ہر بات سے انجانے ہیں
لاکھ بچھ جایئے ، سو طرح سے کوشش کیجیے
ان کے کچھ اور ہی خوش ہونے کے پیمانے ہیں
آبرو بیچ کے کچھ کھوکھلی خوشیاں لائیں
وہ جو دل والے ہیں اس ذوق سے بیگانے ہیں

آمنہ رمیصا زاہدی

نصرت یوسف

یہ سلسلے وفا کے

جنوری کی دھیمی دھیمی دھوپ کی شام تھی۔شجاع اپنے گھر ''مسکن'' کی اوپری منزل پر واقع اسٹڈی روم میں پروجیکٹ رپورٹ تیار کر رہا تھا۔لمبی لمبی کھڑکیوں سے آتی نرم نرم دھوپ اسٹڈی ٹیبل پر گرتی تازگی کا احساس دے رہی تھی۔گولان میں لگے پائن کے درختوں کی قد آور قطار نے دوسرے گھروں سے اوٹ کی تھی تو دھوپ بھی کم کر دی تھی۔مگر پھر بھی دھوپ کی بچی کھچی لکیریں اس سرد موسم میں مکینوں کا موڈ بہتر رکھے ہوئے تھیں۔

شہر کے قدیم علاقہ میں قدیم ہی انداز کی بنی یہ کوٹھی ''مسکن'' شجاع کے دادا عبدالغفار کی ملکیت تھی۔ہجرت کے بعد جو وہ آ کر اس علاقہ میں آ کر آباد ہوئے تو پھر مرے دم تک ''مسکن'' ہی میں مکین رہے۔'مسکن' عبدالغفار ہی کی طرح لگتی تھی۔فراخ، کشادہ اور خوب مضبوط، عبدالغفار کا پیشہ بھی ایسا ہی تھا۔آہنی بھاری بھاری تعمیراتی مشینری، جو ہر تعمیرات کے لئے کرایہ پر حاصل کرنے کیلئے لوگوں کو عبدالغفار سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ ایکسکویٹرز گریڈرز وہیلڈ لوڈرز، لفٹ اور چند ایسے ہی ویوہیکل آلات جو بلڈنگ کی تعمیرات میں ناگزیر ہوتے ہیں عبدالغفار لمیٹڈ سے حاصل کئے جا سکتے تھے۔وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ کام پھلا پھولا ابتدا محض ایک آدھ بنیادی مشین سے ہوئی اور برسوں تک اسی پر انحصار رہا۔گزرتے وقت کے ساتھ کاروباری سرمایہ بڑھا تو جدید مشینیں بھی آتی گئیں۔

عبدالغفار کا کام انجینئر نگ ہی کی شاخ تھی تو ان کا دماغ بھی اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو بنیادی سطح سے دیکھتا ہوا سفر کرتا تھا منظور النسا بہت محبوب بیوی تھیں لیکن پاکستان ہجرت کرنی ان کو منظور نہ تھی تو عبدالغفار نے بھی محبت کے طویل سلسلے کو دارالسلام کی جانب کوچ پر اہمیت نہ دی منظور النساء عبدالغفار کے اس فیصلے پر از حد دل گرفتہ تھیں لیکن ناز و نعم میں پلی۔شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی عورت کیلئے ساحلوں کو چھوڑ کر طوفان میں اترنے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔عبدالغفار سختیوں میں شریک حیات کے ساتھ قدم بڑھانا چاہتے تھے اور وہ کنج بہاراں سے قدم باہر لانا نہ چاہتی تھیں۔ بالآخر وہ گھر عبدالغفار نے چھوڑ ہی دیا جسے بسانے میں دل کی کتنی آرزوئیں شامل تھیں۔ ان کا پورا گھر فسادات کی لپیٹ میں آ چکا تھا جبکہ منظور النساء کا میکہ دہلی کے ان چند بچے کھچے علاقوں میں سے تھا جہاں آگ کی لپٹیں نہ پہنچی تھیں اور اسی بنا پر وہ عبدالغفار کو بھی روکتی تھیں۔ مشکل ترین دور کا آغاز ہوتے ہی عبدالغفار نے اپنے والدین کے مشورے پر بیوی کو بریلی سے دہلی بھجوا دیا تھا۔

کچھ ماہ بعد ان کے ہاں برسوں کے انتظار کے بعد پہلی اولاد کی ولادت متوقع تھی۔سب کو ہی آنے والے اس بچہ کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔کتنے ہی نام اور کتنے ہی تحائف آنے والے بچے کے حوالے سے عبدالغفار کی تین بہنوں اور دو بھائیوں نے سوچ رکھے تھے۔وہ ان سب میں بڑے تھے اور سب ہی بال بچوں والے ہو چکے تھے۔اب گیارہ برس بعد ملنے والی اس خوشخبری نے سب کو ہی بے انتہا خوش کر دیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں تیرہ سال کی منظور النساء کا دولہا بن جانے والے عبدالغفار نے جس وقت اپنے خاکستر گھر پر آخری الوداعی نظر ڈالی تو وہ چھبیس برس کے تھے۔بیوی سے ملنے وہ دہلی گئے ہوئے تھے جب فسادات نے ان کے گھر کو اس وقت متاثر کیا جب تمام بہن بھائی آل اولاد سمیت اپنے باپ کے اچانک بلاوے پر ان کے گھر جمع تھے۔اپنے

تمام تر اثاثوں کو باپ تمام اولاد میں بانٹ کر چاہتے تھے کہ خود پاکستان ہجرت کر جائیں لیکن اس سے پہلے ہی پورا محلّہ لپیٹ میں آ گیا۔ آگ اور خون کی کہانیوں میں ایک اور کہانی کا اضافہ ہو گیا۔ پھر تو پاکستان عبدالغفار کے لئے مزید مقدس سرزمین بن گئی اور اسی تقدیس نے عبدالغفار کو جس وقت پاکستان میں قدم رکھوایا تو جسم پر موجود کپڑوں کے علاوہ ہاتھ میں پکڑا محض ایک چمڑے کا بیگ تھا جس میں ایک جزدان رکھا تھا۔ جابجا آگ کے شعلوں کے نشانات اس پر واضح تھے۔ اس میں رکھا قرآن شکر ہے محفوظ تھا۔ دھجیوں کی طرح بکھر جانے والی زیست پر آنسو بہاتے ہوئے عبدالغفار کو لگتا تھا ان کی سانس بھی اکھڑنے سی لگی ہے۔ چھپتے چھپاتے کس طرح وہ اس جگہ داخل ہوئے اور کس طرح نکلے وہ بھی بڑا ہی جان لیوا وقت تھا۔ جزدان میں لپٹے اپنے باپ کے اس مخصوص قرآن پر نگاہ پڑتے ہی جیسے دل کو ڈھارس سی مل گئی۔ مضبوطی سے اسے تھامتے ان کا سفر واپسی کا جو شروع ہوا تو وہ پاکستان کی سرزمین پر آ کر رکا۔ ان قدموں کو نہ اولاد کی پیدائش کی خبر نے روکا اور نہ ہی پری جمال بیوی کے روپ کی قوسِ قزح نے۔ ہجرت ان کے ایمان کا حصہ بن چکی تھی جس پر کوئی سودا ان کو منظور نہ تھا۔ یہ کون جانتا تھا کہ وہ سرزمین جس کے لئے اپنوں نے عشق وجنون کی مانند انداز رکھا۔ وہ ان کے لئے عزت اور عافیت کا گہوارہ بن جائے گی۔ وہ قرآن جسے انہوں نے بے اختیار تھاما تھا، اسی قرآن کے جزدان میں سونے کی اشرفیاں اچھی خاصی تعداد میں کپڑے میں سلی رکھی ہوئی ملیں۔ جن کے ساتھ ان کے والد عبداللطیف کی تحریر ہی میں رقعہ بھی تھا۔ ''عبدالغفار کے لئے۔''

جب پہلی بار بے کسی کے عالم میں خالی پیٹ عبدالغفار نے جزدان قرآن پڑھنے کے لئے کھولا تھا تو آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ اردگرد کتنے ہی مہاجرین تھے جو ان کی طرح ہی بھوک کے عالم میں تھے مگر پاکستان کی خوشبو نے ان کو مطمئن کر رکھا تھا۔ عبدالغفار بھی چاہ رہے تھے کہ رب سے راز و نیاز کریں۔ حوصلہ مانگیں، قلبی سکون مانگیں کہ دل بیوی بچے کیلئے تڑپنے لگا تھا مگر راتیں مہاجر کیمپ میں گزرتی تھیں، دن معاش کی تلاش میں صرف ہو جاتا۔ ایسے میں منظور النساء اور انعام اللہ کا پانا بظاہر ناممکن ہی تھا۔ رب کے آگے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں آنکھوں سے جاری برسات مستقل گر رہی تھی۔ سامنے رکھے قرآن کے ورق پر بھی بوندیں ٹپک جاتیں۔ حال دل رب کو سنا کر کچھ سکون ہوا اور قرآن کو واپس جزدان میں لپیٹنا چاہا تو کچھ غیر معمولی احساس ہوا جزدان کے موٹے مخملی کپڑے کے ساتھ انگلیاں ابھار سے ٹکرا رہی تھیں۔ بے اختیار انہوں نے اس کو الٹا کر دیا۔ الٹا ہوتے ہی وجہہ سامنے آ گئی۔ دوسرے رنگ کے کپڑے کی جیب سی بنا کر لگائی گئی تھی۔ اس جیب کی سلائی ادھیڑی تو دیکھا کہ بھاری مالیت کے سونے کے سکے اور اشرفیاں اس میں چپکا دی گئی تھیں۔ ابھار کو اوپر کی جانب سے پوشیدہ رکھنے کے لئے جزدان پر جابجا شیشہ کا کام کیا گیا تھا۔ غرض نہ جانے کب سے ماں باپ نے عبدالغفار کے لئے یہ اہتمام کر رکھا تھا۔ شاید تب سے کیا ہو جب سے بیٹے بہو کے سونے آنگن کے ہرا بھرا ہونے کی خبر ملی ہو۔

عبدالغفار کا سر بے اختیار جو سجدے میں گیا تو زندگی کا قرینہ مزید بہتر ہو گیا۔ اللہ نے ان کو ''مسکن'' کی صورت میں بہترین ٹھکانہ دلوایا اور پھر منظور النساء اور بیٹے انعام اللہ سے بھی ملوا دیا۔ ''مسکن'' آباد ہو گیا۔ انعام اللہ کی رونق نے اس میں زندگی بھر دی تھی۔ منظور النساء کی موجودگی نے عبدالغفار کے پھیکے ہوتے وجود میں پھر سے رنگ بھر دیئے تھے۔ انعام اللہ کے بعد رحمت اللہ اور رحمت اللہ کے بعد سیف اللہ مسکن کے وارثوں میں شامل ہوئے اور پھر وقت نے دکھایا کہ عبدالغفار کے تینوں بیٹے قابل ترین پیشوں سے منسلک ہوئے۔ دنیا کی کامیابیوں نے خوب ان کے قدم چومے، وہ بہترین تربیت کرنے والے باپ کی لائق اولاد تھے۔ منظور النساء بہت محبت کرنے والی ماں تھیں لیکن تربیت میں کلیدی کردار عبدالغفار کا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کی یاد اکثر دل میں ٹیس اٹھاتی تھی۔ ملنے والی نعمتوں میں ان کو شریک کرنے کیلئے مسجد کی تعمیر میں حصہ ڈالا تو کبھی کسی شفاخانہ میں کوئی مشین عطیہ کی، کبھی غریبوں میں کھانا تقسیم کیا لیکن لگتا تھا کچھ ایسا ہے جو کرنا باقی ہے۔

اپنے پیاروں کے صدقہ جاریہ کے لئے بنائے تعلیمی ادارہ کے افتتاح کے دن عبدالغفار کی آنکھیں اس روشن چہرے پر جم سی گئی تھیں

گیارہ بارہ برس کا وہ بچہ جس وقت اقبال کی نظم ''چین وعرب ہمارا'' پڑھنے کے لئے بلایا گیا تو اپنے اہل خاندان کے ساتھ موجود عبدالغفار کو امید بھی نہ تھی کہ آنے والا یہ ننھا وجود کیا اہمیت رکھتا ہے۔ادارے کی افتتاحی تقریب تلاوت ترجمہ کے بعد اقبال کی ایک آدھ نظموں کو پیش کر دینے پر مشتمل تھی۔ وفور جذبات سے لبریز عبدالغفار نے نہایت مختصر طور پر قرآنی آیتوں کی تلاوت کے بعد اپنے تاثرات تعلیم، نئی نسل کی دینی وسماجی تربیت اور صدقہ جاریہ کے حوالے سے ادا کئے اور پھر پروگرام کو ترتیب دینے والی انتظامیہ نے اس بچہ کو بلا لیا۔اس مختصر سے وجود کی پرسوز آواز نے عبدالغفار کو جیسے برقی پہنچا دیا تھا۔شفیق ماں باپ، محبت کرنے والے ہیں بھائی چشم تصور میں ابھر رہے تھے۔اور پھر آخری سطر ان کے شہید ہوئے جسموں کا ابھرا تو جیسے طبیعت میں انتہائی بوجھل پن آ گیا۔

''توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے''

بے اختیار انہوں نے دہرایا اور ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھے پوتے پر ڈالی جس کا کچھ عرصہ پہلے ہی کسی عیسائی مشنری تعلیمی ادارہ میں داخلہ کا فیصلہ کیا گیا تھا گو وہ ابھی محض چار سال کا تھا لیکن دو سال بعد ہی اس معصوم وجود کو اس ادارہ میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے ماں باپ، شہر، دوستوں سے دور بورڈنگ میں چلے جانا تھا۔

گو یہ سارا پلان عبدالغفار کی مرضی سے متصادم تھا۔لیکن بیٹا بہو اس معاملہ میں اتنے بے لچک نظر آتے تھے کہ ان کو خاموشی ہی بہتر لگی۔ دل کو ڈھارس تھی تو اس بات سے کہ اس بچہ کے کان میں اولین آواز جو ڈالی گئی وہ ان کی اپنے جذبات سے لبریز ادائیگی کے ساتھ اذان کی آواز تھی۔اللہ اکبر کہتے کہتے جیسے عبدالغفار کے احساسات کی تمام تر شدت الفاظ میں سمٹ آئی تھی۔لا الہ الا اللہ نے دنیا کی کیا، تمام جہانوں کی نفی کر کے شہادت دی تھی کہ معبود بس تو ہی حق ہے۔

پھر اذان ختم ہوتے ہی انہوں نے دل میں رب سے ایک انوکھا سودا کر لیا۔''یارب میں تیری مخلوق کی پریشانیاں ختم کرنے کی کوشش میں لگا رہوں گا تو میرے مولا مجھے اور میری آل کو شیطان کی ڈالی پریشانیوں سے مرتے دم تک محفوظ کر دے۔'' اور پھر عبدالغفار نے اس سودے کی ایک بڑی قسط اپنے بنائے گئے بہترین درجہ کے تعلیمی ادارے میں ہر مستحق ذہین طالبعلم کی فیس معاف کے اصول کو قائم کر کے ادا کی۔اس فہرست کا پہلا طالبعلم شہباز الحق تھا جس نے اقبال کے پیغام کو پرسوز انداز میں ادا کر کے کتنے ہی سننے والوں کی سوچ کی پرواز زمین سے افق تک پہنچا دی تھی۔

''تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا''

عبدالغفار کا بنایا گیا ادارہ اس دور کا تھا جب سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی حالت بہت اچھی تھی لیکن اشرافیہ کا مخصوص طبقہ سابقہ انگریز حکمرانوں کے بنائے گئے اداروں کے منظم سسٹم اور پختہ معیارات سے بہت متاثر تھا۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو اپنے اداروں میں پڑھا کر اعلیٰ سرکاری اداروں کے مئوثر اور طاقتور ترین عہدوں کیلئے تیار کرتے۔ عبدالغفار کی نگاہ مرد مومن کی نگاہ تھی۔عبدالغفار کے والد بھی اپنے دور کے لحاظ سے ایک عالم شخص تھے جنہوں نے اپنی اولاد کو اپنا علم منتقل کیا جس میں نمایاں اور اہم ترین عنصر ذہن کو محدود سے نکال کر لامحدود تصورات اور افکار کو سمجھنے کیلئے تیار کرنا تھا۔

میرے بچو! ہمارا رب الرحمٰن الرحیم ہے اور لامحدود ہے، ہم اس کی ہی مخلوق ہیں۔اس نے اپنی روح سے ہم میں روح پھونکی، اس کا مطلب ہے ہماری صفت میں رحم اور نئی سوچ ہمیشہ رہنی چاہیے۔ احسن الخالقین کی مخلوق کو اپنے خالق کی شاندار صفات کا حصہ دیا گیا ہے اس کو استعمال نہ کرنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔'' عبدالغفار یہ درس سنتے، اپنے والد کے سرخ وسفید چہرے پر ہلتی خوبصورت داڑھی دیکھتے اور سوچتے کیا ابا اس لئے ہی اتنے اجلے ہیں کیونکہ انہیں اللہ کی روح میں سے حصہ دیا گیا ہے؟ لیکن نتھو رام تو ایسا نہیں لگتا اور کرم سنگھ کی بھی داڑھی ہے وہ بھی ایسا نہیں لگتا انہوں نے ایک دن جھجکتے جھجکتے ابا سے یہ سوال کر ہی ڈالا تھا مگر ذرا ترمیم کے ساتھ زمانے کے لحاظ سے چھوٹے بڑوں سے دل کی بات بلا کم وکامت نہیں کہہ سکتے تھے چاہے بڑے کتنے ہی شفیق ہوتے ایک حد تھی جو ان کو روکا کرتی تھی۔سو عبدالغفار نے بھی انہیں سو بیس کی دھائی میں ایک دن اپنے والد کی ٹانگیں دباتے دباتے ہاتھ روک کر سوال کر ہی ڈالا جوان کو الجھن میں ڈالتا تھا۔

''باؤ جی داڑھی تو ہندو کی بھی نظر آ جاتی ہے سکھ کی بھی ہوتی ہے اور ہماری بھی۔ لیکن نتھو رام اور ورکرم سنگھ اور ہمارے چاچا غلام محمد کی داڑھی والی شکل آپ کے جیسی کیوں نہیں لگتی ؟''

عبدالغفار کے والد نے شفیق سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے نو دس سالہ بیٹے کو دیکھا جو فارسی کی تراکیب سیکھنے میں خاصا تیز تھا آثار بتاتے تھے کہ وہ اچھا حکیم اور نبض شناس بن سکتا ہے۔ انہوں نے بیٹے کو مزید کھوجنا چاہا اس لئے پرمزاح انداز میں بولے۔

''کیونکہ وکرم سنگھ سر پر پگڑ لپیٹے رہتا ہے اور نتھو رام سر سے گنجا ہوتا جا رہا ہے اور غلام محمد کالے سیاہ بالوں کے ساتھ خوب گھنی داڑھی رکھتا ہے۔ ہے بھی لمبا چوڑا۔ بس یہ اس لئے فرق تمہیں لگتا ہے۔''

عبدالغفار نے خوب غور سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اس کو لگتا تھا باؤ جی پوری بات نہیں بتا رہے لیکن پاسِ ادب مزید کچھ کہنے سے بھی روکتا تھا۔ چہرے پر پھیلی سوچ کے جال عبداللطیف کی نگاہ میں تھے۔ انہوں نے ٹانگیں سمیٹ لیں تو عبدالغفار نے چونک کر باپ کو دیکھا جنہوں نے پلنگ کے ساتھ بڑی کھڑکی کی چٹخنی گرا دی تھی۔ کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے اندھیرے میں ایک حد تک کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ فروری کی یخ ہوا کا جھکڑ البتہ کپکپی پیدا کر گیا تھا۔

''عبدالغفار اس اندھیرے میں کھڑے درختوں کو کیا تم دیکھ پا رہے ہو؟ یقیناً دھندلا ہی نظر آ رہا ہے۔'' باپ نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دے دیا۔

''ایسے ہی معبود اور عبد کا تعلق ہوتا ہے۔ معبود جیسا ہوتا ہے اس کا عبادت گزار بھی اسی کے اثرات تلے ہوتا ہے۔ جب معبود ہی ظلم اور جہالت کا نشان ہو تو اس کے بندے پر ہر طرح اس کے اثرات نظر آئینگے۔ جتنا وہ معبود کا بندہ ہوگا اتنا ہی اثر اس پر منعکس ہوگا۔ یہ نتھو رام کا چہرہ اور یہ وکرم سنگھ اور غلام محمد کے چہرے اس لئے مختلف ہیں کیونکہ ان کے معبود مختلف ہیں۔ اصل معبود تو ایک ہی ہے لیکن ان تینوں کی چاہتیں ماتھا ٹیکنے کے لئے مختلف ہیں۔ اس لئے زمین اور آسمان کی قوتوں کے اثرات جو مٹی کے پتلے قبول کرتے ہیں وہ بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلا اثر دل قبول کرتا ہے اور دل کا پہلا آئینہ بندے کی شکل ہے عبدالغفار۔''

عبداللطیف کے اردگرد عبدالغفار کو روشنی کا ہالہ بنتا لگا اور جیسے اس کا دل باپ کے فلسفہ کو الفاظ کے حساب میں سمجھا ہو یا نہیں معنوں میں سمجھ گیا تھا۔ عبداللطیف کی لہریں عبدالغفار میں جذب ہوگئی تھیں۔

اور یہ عبداللطیف کی نسل کے وارث عبدالغفار تھے جنہوں نے تھمے ہوئے شاہینوں کو بلند پروازی سکھانے کے لئے تعلیمی ادارے کو صدقہ جاریہ کے لئے منتخب کیا تھا۔ اپنے پیاروں کے سوختہ جسم اور پھر سانحہ سقوط ڈھاکہ نے ان کے دل کو لہولہو کر دیا تھا۔ محض چوبیس سال ہی تو ہوئے تھے! ایک طوفان یادوں کا تھما تھا، جدائیوں کے موسم کو ہتھیلی پر گرتے آنسوؤں نے کچھ مدہم کیا تھا کہ دل پھر ملال سے بھر گیا سارے مناظر جیسے پھر زندہ ہو گئے۔ خاک اور خون کا دریا آنکھوں میں بس سا گیا۔ سرزمین پاکستان دولخت ہوگئی۔

ایسے میں ہی عبدالغفار نے کثیر سرمایہ سے یہ ادارہ بنایا تھا۔ وہ قوم کے شاہینوں کو بلند پروازی پر مائل کرنا چاہ رہے تھے لیکن ان کو اپنے گھر میں ہی نقب لگتی لگ رہی تھی۔ انعام اللہ اور بیگم انعام اللہ اپنی پہلی اولاد صفدر علی کو عیسائی مشنری ادارے سے پڑھانے پر مصر تھے۔ وہ بھی دور علاقہ کا مخصوص ادارہ جہاں سرکاری اہلکار مملکتِ خداداد پر تسلط مضبوط رکھنے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ آقا کے غلام آقا کی غیر موجودگی میں بھی وفاداری نبھاتے اپنی ہی قوم کو فرعونوں کے تسلط میں رکھنا چاہتے تھے اور اس کا اولین ذریعہ تعلیم پر قبضہ ہوتا ہے۔ عبدالغفار کو اپنی ساری تربیت راکھ کا ڈھیر بنتی لگی جس دن صفدر علی کا پہلا فوٹو سکول یونیفارم میں ڈاک سے آیا۔

''پیارے ابا جان صفدر علی عبدالغفار کا پوتا اور انعام اللہ کا بیٹا ہے۔ آپ کو اپنے خون پر اعتبار رکھنا چاہیے۔'' فوٹو کی پشت پر انعام اللہ کی تحریر تھی۔ جو آج کل بیٹے کے پاس ہی گئے ہوئے تھے۔ عبدالغفار نے ایک آزردہ سی سانس لی اور فوٹو منظور النساء کی جانب بڑھا دیا۔ ''میرے رب میرے سودے کو قبول کر لے مجھے اور میرے اہل وعیال کو تا قیامت

شیطان اوراس کی ذریت سے محفوظ فرمادے۔(آمین)''

انہوں نے ایک بار پھر رب کو ہی پکارا جو گہری سیاہ رات میں گہرے سیاہ پتھر پر گہری سیاہ چیونٹی کے حال اور پکار سے بھی واقف رہتا ہے اور پھر اس کی دادرسی بھی کرتا ہے۔ وہی الرحم الرحمین ہے اور وہی ملجا وہی ماویٰ۔

منظورالنساء بتاتی ہیں عبدالغفار اس رات دیر تک جاگتے رہے۔ نہ جانے قلم کاغذ سنبھالے کیا کیا لکھتے رہے۔ اگلی شام جب وہ گھر پہنچے تو چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ عرصہ بعد دارچینی کی چائے بنوا کر پی۔

''میں نے رب سے سودا کر لیا ہے منظورالنساء کاروبار میں لگی جتنی مشینری ہے سب میں نے بانٹ دی ہے۔'' منظورالنساء نے میاں کو اچنبھے سے دیکھا جو باقاعدہ ہاتھ جھاڑتے بستر سے اٹھ کر مغرب کی اذان سنتے کھڑے ہو گئے تھے۔

''کیا مطلب میاں صاحب؟'' مطلب نماز کے بعد بتاؤں گا۔

اذان کا جواب دیتے وہ وضو کیلئے چل دیئے۔

آسمان پر مغرب کے سائے اترنے شروع ہو چکے تھے بادلوں کی ٹکڑیوں کے درمیان سورج کی دھیمی سنہری روشنی تیزی سے غائب ہوتی دنیا کے کسی اور حصے کو منور کرنے چل پڑی تھی۔ ''مسکن'' دن بھر کی بھرپور روشنی سے فیضیاب ہونے کے بعد اب اترتی رات کے پرتوں میں پرسکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ منظورالنساء نے میاں کے بستر سے فاصلے پر بچھے تخت کے ساتھ بڑی کھڑکیوں پر پردے برابر کئے تو گیٹ سے باہر جاتے عبدالغفار پر نگاہ جم گئی۔ ''کتنا منحنی وجود ہو گیا ہے میاں کا'' انہوں نے بے اختیار فکرمندی محسوس کی۔ ''کل ہی دیسی مرغی کا سوپ بنواؤں گی انشاءاللہ۔''

اور پھر صبح صبح نہ جانے ریاض کہاں سے دیسی مرغی لے آیا گوشت ترکاری کے ساتھ کہ انہوں نے سیف اللہ کی بیوی سے کہہ کر میاں کے لئے یخنی تیار کروا دی۔ رات میاں کے بتائے اور کئے گئے فیصلوں نے منظورالنساء کو عجیب گم صم کی سی کیفیت میں ڈال دیا۔ یخنی لے جاتے کئی بار دل میں وہ میاں سے شاکی ہوئیں۔ قدم بھی دھیمے پڑے لیکن نمک کالی مرچ چھڑکا چکن سوپ ان کے بستر تک پہنچ ہی گیا۔

''یہ آج ابھی تک کیوں لیٹے نہیں۔ ناشتہ نہیں کرنا میاں جی؟ پہلے یہ یخنی پی لیں۔'' منظورالنساء نے سائیڈ پر رکھی میز پر یخنی کا پیالہ لگایا۔

''ہمیشہ اپنا من چاہا کرتے ہیں۔ اپنے فیصلوں میں مجال ہے جو مجھے شریک کر لیں۔ اب ساری مشینیں کام کرنے والوں میں بانٹ آئے ہیں کہ ان کی روزی روٹی جڑی رہے۔ ارے خدا ان کا وارث ہے، ہماری وارث ہماری اولاد ہے، ان کے لئے رکھنا تھا نا یہ سب!!'' دھیمے لہجے میں شکوہ کرتی منظورالنساء نے رخ موڑ کر تخت پر رکھا گاؤ تکیہ صحیح کیا۔

بستر پر لیٹے عبدالغفار نے مسکرا کر بیوی کا شکوہ سنا۔ یخنی کی پیالی پر نگاہ ڈالی جس سے دھیما دھیما اٹھتا دھواں بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔

''گرم پیالہ ٹھنڈا ہو جائے گا میاں جی۔'' اب کے منظورالنساء نے خفگی سے کہا۔

''زمین اور آسمان کے خزانوں کا وارث اللہ ہی ہے بیوی!''

''میں نے اپنی تمام اولاد کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے زور بازو سے بہت کچھ پیدا کر سکتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ان کو نور ہی نور کی طرف لے جائے اور نار سے محفوظ رکھے۔ بس اس لئے یہ تجارت کی ہے۔ نار سے بچنے کی تجارت کوئی چھوٹی تجارت تو نہیں منظورالنساء! میرے کام کرنے والے اور ان کے بچے زیادہ مستحق ہیں ان مشینوں کے۔ تم اپنی اولاد کی فکر نہ کرو۔ ان کا معاش میرے معاش سے جڑا نہیں جب کہ ان کا معاش، روزی روٹی یہی ہے۔ باقی اللہ وارث ہے۔ اللہ مالک ہے۔''

عبدالغفار کے چہرے پر طمانیت ہی طمانیت تھی۔

''لاکھوں کا کاروباری سرمایہ ایسے بھی کوئی کسی کے کشکول میں ڈالتا ہے میاں جی! منظورالنساء نے دل کی بات زبان کو منتقل نہ کی اور ناراضگی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ یخنی کا پیالہ جوں کا توں رکھا رہ گیا۔ ہاں باہر نکلتے انہوں نے میاں کی آواز سنی جو اس آواز سے مختلف تھی جو انہوں نے کچھ لمحوں قبل سنی تھی۔

''آیئے آیئے!''

منظورالنساء نے چونک کر مڑ کر دیکھا کوئی بھی نہ تھا۔ میاں

صاحب بدستور لیٹے ہوئے تھے۔ ''شاید میرا واہمہ ہو۔'' انہوں نے سر جھٹکا اور کوٹھی کے لان کی جانب آ گئیں اور وہ منظور النساء اور عبدالغفار کی اس دنیا میں آخری ملاقات تھی۔ یخنی کی پیالی بھی جوں کی توں تھی۔ بس ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ایسے جیسے عبدالغفار کا حرارت سے بھرپور وجود ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

نیکی اور احسان کے سودے نے کفن میں لپٹے عبدالغفار کے وجود کو پھولوں کی مانند پر بہار کر دیا تھا۔ آسودگی چہرے پر واضح تھی جیسے انسان بہت شاداں و فرحاں کیفیت میں ہو جیسے روح پر چھائے رکھے ہوں جیسے ہر جانب گلاب رت ہو۔ منظور النساء نے بے اختیار میاں کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کسی نے بازو سے تھام کر پیچھے کر دیا۔

اگلے برس جب سیف اللہ کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر بچے کی ماں کی جان بچانے کیلئے خون کی ضرورت پڑی تو شہر بھر میں اس کا خون گروپ نایاب تھا۔ زمین اور آسمان کے سارے خزانے اس وقت ہیچ تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور مطلوبہ خون جیسے عنقا ہو چکا تھا۔ موت کے پروں کی آہٹ سیف اللہ کو ڈاکٹر ہونے کے باوجود ہر لمحہ محسوس ہوتی تھی۔ ''میری بیوی! میرا بچہ!'' اس نے سسکاری سی بھری اور ہسپتال کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ ''مبارک ہو سر خون کا انتظام ہو چکا ہے۔'' کسی نے چیخ کر سیف اللہ کو اطلاع کی تو اس کو لگا جیسے صحرا سے وہ نخلستان میں یکا یک آ کھڑا ہوا۔ رب سے، ہمت سے پیدا ہوئے شکوے، تلخ سوچیں، دکھ جیسے یک لخت غائب ہو گئے۔ بھاگتے ہر قدم کے ساتھ وہ ندامت کے اشک آنکھوں میں بھرے الحمدللہ یا رب العالمین زیر لب پکارتا ہوا آپریشن روم کی جانب بڑھ رہا تھا وہ جو کچھ دیر قبل رب سے کہہ رہا تھا کہ میری وفاؤں کا کچھ تو خیال کر، مجھے آزمائش میں جھلسا، وہ بندہ مطلوبہ نعمت سے فیضیاب کیا جا چکا تھا۔ کٹھن آزمائش سے اس کو نکالا جا چکا تھا سیف اللہ کا بیٹا شجاع دنیا میں بخیر و عافیت اپنے والدین کے سائے تلے سانس لے رہا تھا اور 'مسکن' کے مکینوں کے ان تمام قدموں کو سنبھالا مل گیا تھا جو نور سے ان کو نار کی جانب رخ کرا دیتے۔ خون دیا بھی تو کس نے؟ اسی شہباز الحق کے باپ نے جو شجاع کے دادا عبدالغفار کے بنائے تعلیمی ادارے کا وہ بچہ تھا جس نے ''کلام اقبال'' پڑھا تھا اور پھر وہی اس ادارے کا وہ پہلا طالبعلم بنا جس کے اخراجات ادارہ کے ذمہ تھے۔ جس کے والد اس ہسپتال کے باغبان تھے۔ عبدالغفار کی تجارت بھی کیا خوب تجارت تھی کہ وہ باغبان خود بھی تھے اور باغبان ہی ان کی نسل کی عافیت کے لئے مہیا کر دیئے گئے۔

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ

مرے ساتھ ساتھ رہا کوئی

قانتہ رابعہ کا تازہ افسانہ

سات بج کر ایک منٹ پر صبا سب سے پہلے کالج میں داخل ہوئی اس نے اپنے گروپ کے مخصوص ٹھکانے المعروف 'گوشۂ عافیت' میں پہنچتے ہی ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

''ہائیں اُشنا ابھی تک نہیں آئی؟ یا اللہ خیر...... وہ تو وقت کی پابندی میں سورج چاند ستاروں کو بھی پیچھے چھوڑنے والی تھی آج کیا ہوا؟'' دو ایک منٹ کے بعد گروپ کی دوسری 'الہڑ مٹیار' عفیفہ خالد بھی پہنچ گئی۔ صبا کو اکیلا دیکھ کر اس کے منہ سے بھی وہی فقرہ برآمد ہوا......نظریں چاروں طرف گھماتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

''ارے اُشنا کی بچی نہیں آئی آج......؟''

عفیفہ بھی بہانگ دہل گواہی دینے کو تیار تھی کہ اشنا اور تاخیر ہو جائے؟؟ ہرگز نہیں بھئی یہ تو ممکن ہی نہیں......ان دونوں کے آگے پیچھے زنیرہ بھی آ گئی......قصۂ چہار درویش یا دوسرے لفظوں میں چار کے ٹولے کی تیسری رکن۔

''کچھ منہ سے تو پھوٹو یہ اشنا کہاں ہے؟ کہیں آج اسے پھر نئی طرز کی نیکی کا دورہ تو نہیں پڑ گیا جو وہ ابھی تک نہیں پہنچی؟''

اگلے آٹھ دس منٹ وہ تینوں مل کر اشنا کی نیکیوں کو یاد کر کر کے ہنستی رہیں۔ کبھی پورا جیب خرچ غریب طالبہ کے حوالے کر دینا، ٹفن بغیر کھولے کسی کو بھوکا سمجھ کے تھما دینا۔ کبھی دن رات کی محنت ومشقت سے بنائے نوٹس کسی غیر حاضر رہنے والی طالبہ کو مدد سمجھ کر دے دینا بلکہ......

''ایک دفعہ تو تم لوگوں نے دیکھا تھا وہ ننگے پاؤں کالج آئی تھی راستے میں سردی سے ٹھٹھرتی بوڑھی ملازمہ کو جوتا اتار کر دے دیا تھا۔'' عفیفہ نے یاد دلایا۔

پھر تینوں ہی خاموش ہوگئیں......صبا پریشانی سے بولی۔

''ٹائم کیا ہے عفو؟؟ پیپر تو شروع ہونے والا ہے......''

''آٹھ بجنے میں نو منٹ ہیں......'' عفیفہ نے جواب دیا۔ تینوں کے چہرے کسی انہونی کے لیے تیار تھے......اشنا کی طرف سے ضرور کوئی بری خبر ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے کیریئر کا سب سے آخری پیپر چھوڑ دے؟؟

اشنا موبائل فون نہیں رکھتی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں جتنی تیزی سے آگے جا رہی تھیں تینوں کے دل کی دھڑکن اس سے بھی تیز ہو رہی تھی...... ہال کے دروازے سے بھی وہ جھانک جھانک کر دیکھتی رہیں شاید اب اندر آنے والی سٹوڈنٹ اشنا ہی ہو......شاید......شاید۔

لیکن اشنا نہ پہنچ سکی اور وہ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ پیپر بے حد مشکل اور کسی حد تک بڑا ہی کنفیوزنگ تھا......اس مشکل وقت میں بھی انھیں وقتاً فوقتاً اشنا یاد آتی رہی...... اللہ کرے وہ کچھ دیر سے ہی سہی امتحانی ہال میں پہنچ چکی ہو......اللہ کرے میم شازیہ نے اس کے شاندار تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے اسے کسی نہ کسی رول نمبر کے آگے پیچھے ایڈجسٹ کر دیا ہو۔ لیکن نہیں......''ہم نے اس سے بات ہی نہیں کرنی......کیسے خون خشک کیا ہے آج ہمارا......آئے گی تو پھولے سانسوں میں بھلے جتنا بھی یقین دلائے ہم نے اسے منہ بھی نہیں لگانا......آئی بڑی خدمت خلق کی ٹھیکیدار......''

سب سے پہلے صبا نے پیپر نگران کو پکڑایا پھر عفیفہ اور زنیرہ بھی فارغ ہو کر ہال کے باہر آ گئیں......دور دور تک اشنا کا نام ونشان نہیں تھا۔

''مجھے پتہ ہوتا تو میں ہی آتے ہوئے اسے ساتھ لے آتی میرا تو گھر بھی کرسچن کالونی کے بہت قریب ہے......'' زنیرہ دھیمے لہجے میں

بولی۔

ہاں اُشنا کرسچن تھی!!

نیک دل، پاکبازی میں ان تینوں سے بہت آگے، ملنسار، انسان کی خدمت کو عبادت سمجھنے والی، ہر لحہ چوکس، ہوشیار، خدمت خلق کے ہر کام میں سب سے آگے، ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، ٹیچرز کی پسندیدہ، ہر کسی کے دل میں جگہ بنانے والی......

لیکن......وہ......کرسچن تھی......

ان چاروں کے درمیان تعلیمی زندگی کے آغاز میں ہی خاموش معاہدہ ہو چکا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے مذہب کو کسی بھی کام کے لیے حوالہ نہیں بنائے گا......سو کالج کی اکثر طالبات اس سے لاعلم تھیں کہ وہ کرسچن ہے......علم ہوتا بھی کیسے؟ اسلامیات میں اس کے سب سے زیادہ نمبر ہوتے تھے......نعتیں بھی اکثر وہ آنکھیں بند کر کے ایسے پڑھتی کہ سننے والے بھی سرکارِ مدینہ کے دربار میں پہنچ جاتے۔

ان تینوں کے چودہ سالہ تعلیمی کیریئر کا آج اختتام تھا۔

''کیا کیا منصوبے بنائے تھے کہ آخری دن ہر ٹیچر کو کس طرح وش کریں گے۔ کیا کیا ہلا گلا ہوگا۔ اگلی زندگی میں اس دن کی یادیں چھپر چھاؤں بن کر ساتھ رہیں گی......مگر اشنا، ہائے وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گئی ہو......'' تینوں کے چہروں پر غم، فکر، پریشانی، دکھ، افسوس کی روتی کرلاتی تحریر تھی......اشنا کا مستقبل ہی برباد ہو گیا......

''چلو یہاں افسوس کرنے کے بجائے اس کے گھر چلتے ہیں۔'' زنیرہ نے کہا۔

''دیکھ لو......کہیں اور مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے......اللہ جانے کیا معاملہ ہوا ہے اس کے ساتھ۔'' صبا نے کہا۔

''تو پتہ چل جائے گا ناں......'' زنیرہ نے کہا اور کالج پر الوداعی نظر ڈالتی رکشہ پر کرسچن کالونی چلی گئیں......دروازہ کھلا تھا سامنے ہی اشنا لیٹی ہوئی تھی......آنکھیں سوجھی ہوئی نہ چہرہ بیمار......وہ تو چھوٹے بھتیجے کو سلا رہی تھی......

''آج پیپر تھا باٹنی کا......؟'' صبا چیخ کر بولی۔

''ہاں مجھے پتہ ہے......'' اشنا نے جواب دیا۔

''پیپر کیوں نہیں دیا؟'' زنیرہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

''پیپر دینا میری قسمت میں نہیں تھا......'' اشنا کے چہرے پر کوئی تاسف نہیں تھا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟ چودہ سالہ محنت کے ضائع جانے پر تمھیں کوئی افسوس نہیں؟'' عفیفہ نے غصے سے اسے گھورا......''ہم خوامخواہ فکرمند ہوتے رہے......''

''افسوس تو تب ہوتا جب بغیر کسی وجہ کے محنت ضائع چلی جائے......'' اس نے کہا۔

''کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟ آرام سے بتاؤ کہیں آج پھر خدمت خلق کا دورہ تو نہیں پڑ گیا تھا۔'' عفیفہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کو ایک دھموکا لگا دے۔

''ہاں یہی سمجھ لو......'' اشنا سکون سے بولی۔

''کیا......؟'' تینوں چیخیں ''تمھارا دماغ ٹھیک ہے......؟ چودہ سال کی محنت کدھر گئی؟''

''یہ کیا تم چودہ سال چودہ سال کا ورد کر رہی ہو۔ بس کہہ دیا ناں ڈگری کے بغیر بھی اور ڈگری کے ساتھ بھی کام تو بندے کا ایک ہی ہے......''خدا کو راضی رکھنا''......ٹھنڈے لہجے میں اشنا نے کہا۔

تینوں اسے دیکھ رہی تھیں......''یعنی تم نے کسی مستحق کی مدد کے لیے اپنا کیریئر داؤ پر لگا دیا......؟ اب تمھیں اگلے سال بی ایس سی مکمل کرنے کی توفیق ہوگی وہ بھی اگر اس عرصہ میں کوئی اور مددگار تم تک نہ پہنچ سکا......؟'' صبا نے اسے دیکھا۔

''یہی سمجھ لو......'' بے نیازی سے اشنا نے کہا۔

عفیفہ کی آنکھوں میں پانی جھلمل جھلمل کر رہا تھا......وہ بولی......

''اشنا کیا میں معاہدہ کی خلاف ورزی کر سکتی ہوں؟''

اشنا نے بس اسے دیکھا ضرور......بولی کچھ نہیں......

''تم مسلمان ہو جاؤ......خدا کی قسم جو کسی بھی انسان کی مدد کے لیے اپنے چودہ سال کا خیال نہیں کرتی اسے آگ میں نہیں جلنا چاہیے!!

اشنا پلیز، تم ہم سے زیادہ اسلام کا مطالعہ کر چکی ہو کیوں اسے قبول نہیں کرتیں؟''

''اس لیے کہ اگر اسلام تم لوگوں جیسا ہے تو مجھے قبول نہیں...... اگر تمہارے پیغمبر جیسا ہے تو میں اس کے قابل نہیں......''

اشنا نے رندھی آواز میں فقرہ مکمل کیا اور چائے پانی کے بہانے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

☆......☆......☆

صبا، عفیفہ اور زنیرہ کا پل پل بھر کا رابطہ تھا...... ہاں اشنا سے ان کا باوجود کوششوں کے رابطہ نہ ہوسکا۔ موبائل فون اس کے پاس تھا نہیں اور لینڈ لائن خراب تھا۔ باٹنی کے پیپر کے لیے تینوں ٹینشن میں تھیں۔ پیپر خراب ہوا تھا اور طلبہ کی طرف سے اکا دکا خبریں ملتی رہتی تھیں کہ نظامت تعلیم والے کچھ سوچ رہے ہیں......

کیا سوچ رہے ہیں؟ یہ انھیں ہفتہ دس دن کے بعد ہی پتہ چل گیا۔ باٹنی کا پیپر دوبارہ ہوگا...... نئی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا...... محض سترہ دن کے بعد......

''اشنا...... تم خدا کو تو اتنی محبوب ہو، تمھاری وجہ سے پیپر ہی کینسل ہوگیا کہ تمھارا تعلیمی سال ضائع نہ ہو......'' تینوں دنگ تھیں اور خوشخبری دینے اس کے دروازے پر کھڑی تھیں جو بار بار دستک پر نہیں کھل رہا تھا۔

السلام علیکم کی آواز پر تینوں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

اشنا گاؤن سکارف میں ان کے پیچھے کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں قرآن کی تفسیر تینوں کو نظر آرہی تھی......

''اشنا، تم......؟'' گھٹی آواز میں وہ بولیں۔

''ہاں میں...... مسلمان ہوگئی ہوں......'' وہی سکون، ٹھہراؤ، جو اس کے چہرے پر ہمیشہ رہتا تھا اب نور کے ہالے میں بدل چکا تھا۔

''کیسے؟ میرا مطلب ہے کب؟'' زنیرہ خوشی سے چیخی۔

''اندر چلو...... میں بتاتی ہوں......'' اشنا نے تالا کھولتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

''جس دن باٹنی کا آخری پیپر تھا میں پونے سات بجے گھر سے نکلی۔ رکشہ والا چھٹی پر تھا۔ میں نے سوچا اگلے چوک پر کئی رکشے کھڑے ہوتے ہیں میں وہاں سے رکشہ لے لوں گی تیز تیز چلتے ہوئے بے دھیانی میں مجھے ٹھوکر لگی۔ میری ٹھوکر کی زد میں ایک سات آٹھ سالہ بچی آئی جس کے ہاتھ میں انڈوں کا شاپر، چنے کے سالن کا ڈونگہ تھا...... میں تو گرتے گرتے سنبھل گئی لیکن بچی بہت طرح سے گری اس کی کہنی بری طرح سے چھل گئی تھی۔ لیکن بچی کو چپ کروانا مشکل ہوگیا تھا...... اسے اپنی چوٹ کی فکر نہیں تھی وہ ٹوٹے انڈوں اور گرے ہوئے سالن کو دیکھ رہی تھی...... پہلے میں نے سوچا کہ میں بھی بغیر معافی تلافی کے گزر جاتی ہوں یہاں تو گاڑیوں والے غریبوں کو کچل کر چلے جاتے ہیں کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا یہاں کون سا کوئی ذی روح جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا یا لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہوگیا تھا۔

میں نے پہلے تو فرار ہونا چاہا پھر یسوع کے کلام سے روشنی ملی کہ جو مخلوق کو اذیت دیتا ہے وہ خداوند کو اذیت دیتا ہے...... میرے چلتے قدم رک گئے۔ میں نے روتی بلکتی بچی کو دیکھا اور اپنی جیب سے کرائے کے سو روپے اسے تھما دیے کہ یہ چیزیں دوبارہ لے لو اور گھر چلی جاؤ...... بچی پیسے پکڑ کر اور زیادہ اونچی آواز سے رونے لگی۔

میری ماں سوتیلی ہے، اس نے ہچکیوں سے بتایا...... دیر ہونے پر وہ میرا مار مار کر بھرکس نکال دے گی اور ساتھ ہی ابا بھی مارے گا...... میں نے جلدی جلدی سڑک کے پار والی اسی بیکری سے انڈے اور نان چنے خرید کر اسے تھمائے کہ بیٹا جلدی سے گھر لے جاؤ...... بچی بدستور رو رہی تھی کہ اس کی ماں اسے بہت مارے گی اور یقین نہیں کرے گی...... چھلی کہنی، رستا زخم اسے کچھ نظر نہیں آئے گا......

میرے چلتے قدم زمین نے زندگی میں پہلی دفعہ روک لیے......

زمین نے مجھ سے سوال کیا، اشنا بی بی اب کیا ہونا چاہیے؟؟

میرے اندر سے آواز آئی...... رب کے بندوں سے پیار رب سے ہی پیار ہے۔ وہ لمحہ جب مجھے پیپر چھوڑ کر اس بچی کی انگلی تھامے اس کے گھر میں داخل ہونا پڑا میری زندگی کا کڑا امتحان تھا...... فیصلہ تو بس

اسی ایک لمحے کا تھا جب میں اس کے گھر داخل ہوئی، کرخت چہرے والی اس کی سوتیلی ماں کو سارا قصہ سنایا......اس کی طرف سے معافی مانگی...... کھول کر ہر چیز کی وضاحت کر دی کہ بچی کا کوئی قصور نہیں ...... بچی سہمی شکل کے ساتھ کونے میں کھڑی رہی ...... ماں کا چہرہ سپاٹ ہی رہا...... میں بجھے دل کے ساتھ اس کے گھر سے نکلی تو ماں کی آواز آئی۔

''پہلے اپنے یاروں پیاروں کے چکر میں آنکھیں بند کر کے چلتی ہیں، نقصان ہو جائے تو معافیاں مانگتی ہیں تا کہ بلے بلے ہو جائے۔''

فقرہ تھا یا نیزے کی انی......آٹھ بج کر دو منٹ ہو چکے تھے۔ کالج جانے کا فائدہ نہیں تھا...... میں دو گھنٹے گھوم پھر کر جب گھر آ رہی تھی تو کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح یہی فقرہ آ رہا تھا جس نے میری روح تک کو چھلنی کر رکھا تھا......میں انسان ہی ہوں پرچہ نہ دینے کا صدمہ بھی بہت تھا جب چلتے چلتے ایک کاغذ کا پرزہ گرا نظر آیا...... بظاہر صاف ستھرا کاغذ تھا جیسے کسی کے نوٹس ہوں مگر میری نظر ٹھٹھکی ......قرآن مجید کی کسی آیت کا ترجمہ تھا......اور تم دوسروں کے معبودوں کو برا مت کہو، کہیں وہ تمھارے معبود کو برا کہہ بیٹھیں......''

یہ کیا بات تھی؟ کیا یہ الہامی کلام ہے......؟ اس کا جواب تو مجھے مل گیا لیکن یہ لمحہ پہلے لمحے سے بھی کٹھن تھا......کیا میرے رب کو عزت نفس اتنی محبوب ہے کہ وہ جھوٹے معبودوں کی ہی کیوں نہ ہو، خراب کرنا اسے گوارا نہیں؟

یہ کلام ربی ہی ہے! میرے دکھے ہوئے دل نے گواہی دی اور پھر میں نے اپنی سب سے قیمتی متاع......اپنا دل اسلام کو دے دیا......''

چمکتے چہرے کے ساتھ اشنا ہنستے ہوئے بولی۔

''اب کیا وہ میرے لیے میرا چھوٹا ہوا پرچہ دوبارہ لینے کا بندوبست نہ کرتا؟''

اشنا نے سوال کیا۔ تینوں کی نگاہیں بھی سجدہ کر رہی تھیں اور جبینیں بھی۔

☆......☆......☆

افشاں نوید

وقتِ فرصت ہے کہاں!

سارے خاندان کیلئے ہی بہت خوشی و انبساط کی خبر تھی مسز قائم خانی کا اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے سے پروفیسر کے عہدے پر ترقی کرنا اور یوں پلک جھپکتے تو نہیں مل جاتا یہ مقام۔ ان کی دو عشروں پر پھیلی ہوئی تعلیمی اور تخلیقی خدمات تھیں اس یونیورسٹی کے لیے۔ ان کی ساتھی اساتذہ نے اس خوشی میں اگلے ہفتے ان کے لئے ڈنر کا اہتمام کیا تھا ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں۔

اتفاق سے وہ اس خوش خبری کے بعد ہفتہ بھر سے یونیورسٹی ہی نہ جا سکیں۔ عجب شش و پنج میں گزر رہے تھے روز و شب ان کے بچوں کو پال کے، ان کو گھر بار کا کر کے، میاں بیوی سکھ کا سانس ہی لیتے ہیں کہ گویا اب سب کچھ ہو گیا۔ واقعی رشتوں ناطوں کی تلاش، بچوں کو ان کے گھر بار کا کرنا کوئی بائیں ہاتھ کا کھیل تھوڑی ہے۔ جب تین بچوں میں آخری بیٹی ماہا کی شادی ہو رہی تھی قائم خانی صاحب اکثر مسکرا کر کہتے:

''بیگم بھلا اب ہم کیا کریں گے ماہا کی رخصتی کے بعد؟ چلو سیاحت کی پلاننگ کرتے ہیں اکٹھے دنیا دیکھیں گے'' کبھی کہتے:

''تم اپنی ادھوری شاعری کی کتاب مکمل کرنا، میں فارم ہاؤس کو وقت دونگا، گھر کے جھمیلوں میں اس کی مزید تعمیر و ترقی پر توجہ ہی نہ دے سکا۔ سرمد صاحب کو دیکھو انہوں نے دلجمعی سے وقت دیا تو ان کا فارم ہاؤس آج شہر کے بڑے فارم ہاؤسز میں شمار ہوتا ہے''۔

کبھی باغبانی کی پلاننگ کرتے، کبھی اسکول کھولنے کی کہ قوم کے نونہالوں کیلئے کچھ کر گئے تو عاقبت سنور جائے گی۔

ماہا کی شادی کو ماشاءاللہ ایک برس ہو گیا تھا۔ سامعہ کی شادی کو پانچ برس ہو گئے تھے۔ سامعہ کا سسرال اچھا پڑھا لکھا گھرانہ تھا مگر بھرے پرے گھر کے مسائل تو ہوتے ہی ہیں ناں! پھر خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، اقدار و روایات ہر گھر کی دوسرے سے جدا ہی ہوتی ہیں۔

سامعہ اُس گھر کی چوتھی بہو تھی۔ اب ظاہر ہے تین جٹھانیاں الگ الگ ماحول سے آئی تھیں۔ وہ بھی کئی سالوں میں ہی اس ماحول میں رچی بسی ہوں گی جس ماحول کو قبول کرنے پر سامعہ کا ذہن آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اسے یہ عجیب غیر علمی سا ماحول لگتا جہاں کھانے پکانے، نت نئے ڈیزائنرز کے کپڑوں اور مارننگ شوز پر تبصروں کے علاوہ خواتین کے پاس کوئی کام ہی نہ ہوتا تھا۔ کیا انہی دائروں کے گرد گھومنا چاہیے زندگی جیسی قیمتی چیز کو وہ سوچتی۔ اس کو بالکل مزا نہ آتا جٹھانیوں کی محبت میں، پھر ان کے بچوں کے جھگڑے۔ ان کا بڑھا چڑھا کر بچوں کی کارکردگیاں پیش کرنا۔ دوسرے کے بچوں کو تعلیمی و اخلاقی لحاظ سے اپنے بچوں سے کم ثابت کرنا۔ یہ ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے کے موضوعات ہوتے تھے۔ حقیقت میں نہ وہ خود پسند تھی نہ اسے میاں مٹھو بننا پسند تھا۔ کیونکہ ان بہن بھائیوں کی غیر معمولی علمی کارکردگی پر خاندان تعریف کرتے تو امی ابو کبھی پسند نہ کرتے کہ بچے سر نہ چڑھ جائیں بلکہ اس موقع پر ضرور اس بچے کی کوئی کمزوری بیان کر دی جاتی اور اڑتی پتنگ کی ڈور واپس کھینچ لی جاتی۔

شاہ زیب بہت اچھا شوہر تھا مگر سسرال صرف شوہر کا نام تو نہیں ہے ناں! ان تین جٹھانیوں کے ساتھ گزارا کرنا جبکہ وہ سب ساس سسر کی بھی چہیتی تھیں۔ ساس سسر کی ان سے ڈیمانڈ بھی کیا تھی؟ وہ تو اسی بات پر نازاں و فرحاں رہتے کہ وہ اپنے شوہروں کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی عزت کرتی ہیں۔

کون سا دن جاتا تھا جب دن بھر کی کشمکش سے گزری ہوئی سامعہ

اپنی ماں کو فون کر کے دل کی بھڑاس نہ نکالتی ہو۔ وہ اپنے شوہر کو تو قائل کر چکی تھی کہ اس کی یہاں کے ماحول سے مطابقت نہیں ہے اور لہٰذا اسے علیحدہ گھر چاہیے مگر یہ امی جان کیسے قائل ہوں؟۔

مسز قائم خانی زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ جذباتی فیصلہ نہ کرے۔ اب اس کے ہاں ولادت ہو گی تو یہ بھراپُرا خاندان ہی کام آئے گا اور بچہ ہوا تو واقعی ذہن بھی فضول سوچوں سے ہٹ گیا۔

اب ماشاءاللہ سامعہ بھی تین بچوں کی ماں ہے۔ مگر اس کو اس گھر میں ایڈجسٹ کرنے کیلئے مسز قائم خانی کو کتنے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ ساج بھر سے مثالیں چھانٹ چھانٹ کر دیتیں اس کو بہوؤں اور بیٹیوں کی کہ وہ عبرت حاصل کرے اور اپنی سسرال کی قدر کرے اگر مسائل پیدا کرنے والی ساس ہوتیں تب اسے پتہ چلتا کہ سسرال کہتے کسے ہیں۔

ایک طرف سامعہ کی بھری سسرال مسئلہ تو دوسری طرف ماہا کی تنہائی! ان کی ایک ہی جٹھانی تھیں جو بیرونِ ملک رہتی تھیں۔ اب تنہا خاندان کی ذمہ داریاں اٹھانا ساس سسر میں سے کوئی بیمار ہوتا تو تانتا بندھ جاتا ان کے بہن بھائیوں اور بھتیجے، بھتیجیوں، بھانجی بھانجیوں کا...... وہ تنہا کہاں تک نبھائے ان رشتوں کو؟ اس کو رشک آتا سامعہ پر کہ ایک ڈش ایک جٹھانی نے بنا لی دوسری ڈش دوسری جٹھانی نے۔ ان کے فریزروں سے کچھ نہ کچھ نکل آتا، یوں وقت بے وقت ایک بوفے کا مکمل اہتمام ہو جاتا مل جل کر۔ آنے جانے والے الگ خوش ہو کر جاتے اور کسی پر تنہا بوجھ بھی نہ پڑتا۔

ماہا کا دل لگنے کے تو واقعی سامان کم تھے سسرال میں۔ شوہر رات گئے آتے اپنے کلینک سے۔ ساس سسر اپنی مختصر سی دلچسپیاں رکھتے جو نماز، تلاوت ذکر و وظیفہ تک محدود ہوتیں۔ دونوں طبیعتاً کم گو تھے اور بیشتر وقت مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ چونکہ ذمہ داری تنہا تھی اس لئے ماہا کی میکے آنے کے امکانات بھی کم تھے۔

''ماہا تم خواہ مخواہ سٹریس لیتی ہو۔ بھرے خاندانوں کے اپنے مسئلے ہوتے ہیں۔ پھر شرجیل اتنے اچھے شوہر ہیں، بس شکر کے طریقے سوچا کرو۔''

مسز قائم خانی اس سے خفا ہوتے ہوئے کہتیں۔ روز کتنا وقت ان دونوں کے مسائل اور بچوں کے مسائل پر فون پر گفتگو کرتے ہوئے گزر جاتا۔

مسئلہ تو کچھ کم عائشہ نے بھی پیدا نہ کیا تھا جوان کی اکلوتی بہو تھی۔ عائشہ طبیعت کی بری نہ تھی لیکن فہد کے ساتھ اس کی ہم آہنگی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ وہ بھرے پُرے گھر سے آئی تھی شور شرابے والا ماحول، پکنک پارٹیوں کی دلدادہ، یہاں کا علمی اور سنجیدہ ماحول اس کو چڑ چڑا بنا دیتا تھا۔ جب ننھے میاں حمزہ دنیا میں تشریف لے آئے تب تو معاملات بہت حساسیت اختیار کر گئے۔ اب مسز قائم خانی کو اپنا پورا کردار ادا کرنا تھا۔ عائشہ کے اندر کے خلا کو بھی پر کرنا اور فہد کو بھی ٹھنڈا رکھنا اور گاہے گاہے اس کے سامنے عائشہ کے کردار کی خوبیاں بیان کرنا چاہے اس میں مبالغے سے کام لینا پڑے! فہد کیلئے یہ بڑے حوصلے کی بات تھی کہ عائشہ امی کو خوش رکھتی ہے۔ حالانکہ حقیقتاً تو امی عائشہ کو خوش رکھنے کی ہزار ہزار تدبیریں سوچا کرتیں۔ وہ تو دو سال فہد کی پوسٹنگ دوسرے شہر ہو گئی تو گھر میں امن رہا۔ اب پھر کل فہد کا فون آیا تھا کہ وہ دوبارہ واپس آرہے ہیں اور اب اس نے مستقلاً پوسٹنگ کراچی کرا لی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ عائشہ لاہور میں نسبتاً کنٹرول میں رہی جبکہ یہاں امی کے ساتھ رہ کر وہ اپنے ناز اٹھواتی ہے۔ کہنے لگا۔ اب آپ اس کو دبا کر رکھئے گا میں بڑی مشکل سے اسے راہ راست پر لایا ہوں اور بہت سختی کرتا ہوں اس کے ساتھ''۔

لفظ ''سختی'' تو انہیں ذرا نہ بھایا، پیار سے بولیں ''بیٹا وہ تمہارے دو بچوں کی ماں ہے اور ماؤں کے ساتھ سختی کیسی؟''

یہ سننا تھا کہ فہد کا پارہ چڑھ گیا، بولا ''آپ خود ہی سنبھالئے گا اسے۔ پہلے بھی آپ کا لاڈ اسے بگاڑتا رہا ہے۔''

اِدھر عائشہ، فہد ان کے خاندان کی آمد تھی، ادھر ماہا کو حمل کے آغاز میں ڈاکٹر نے کچھ پیچیدگیوں کے باعث مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیدیا۔ شرجیل اسکو دواؤں اور ہدایات کے ساتھ میکے چھوڑ گئے کہ ان کی بیمار بوڑھی ماں کے تو بس کی بات نہیں ماہا اور چند ماہ کی نویرہ کی

خدمت......مسز قائم خانی نے بوجھل دل کا بوجھل پن ذرا بھی چہرے پر نہ آنے دیا اور بہت تسلیاں دے کر شرجیل کو رخصت اور ماہا کو خوش آمدید کہا۔ چھ ماہ کی نویرہ کی دیکھ بھال کوئی معمولی کام تو نہ تھا جبکہ بچوں کو ماسیوں کے رحم وکرم پر نہ انہوں نے اپنے چھوڑا نہ اپنی اولادوں کے بچوں کے لیے وہ یہ آپشن پسند کرتی تھیں۔

نویرہ کو گود میں لے کر اس کی چمکتی آنکھوں میں انہیں ایک نئی دنیا نظر آئی۔ کتنی پیاری من موہنی صورت ہے اس کی! انہوں نے اس ننھی جان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ کتنا سکون ملا انہیں جیسے ماہا ایک بار پھر ان کی گود میں آ گئی ہو۔ انہوں نے شوہر کی گود میں نویرہ کو دیا۔ اور بولیں:

''بس یہ ہے شاعری کی ادھوری کتاب۔ اور ''سیاحت'' کیلئے فہد، عائشہ اور ان کے بچے ہی کافی ہیں۔ آپ کے فارم ہاؤس کی تکمیل کے خواب ادھورے ہی بہتر ہیں۔ ہمیں اپنے ''ہاؤس'' کی تکمیل کرنا ہے۔ دنیا کے ہر فارم ہاؤس سے زیادہ پیارا ''میرا گھر'' ہے۔

''یہ گھر ہنستا بستا رہے گا تو باقی خواب بھی پورے ہو جائیں گے اگر اللہ چاہے۔''

وہ یہ سوچتے ہوئے مسکرا رہی تھیں کہ کیسی سطحی تھی ہماری سوچ کہ اب ہم فارغ ہو گئے۔ نہیں ہماری اصل ذمہ داری تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ صرف بچے پال پوس کر ان کو اپنے گھروں میں روانہ کر دینے سے تو ہم فارغ نہیں ہوں گے۔ اب تو اصل مصروفیت شروع ہوئی ہے بیٹیوں کو ان کے گھروں میں آباد کرنا۔ اپنے تجربوں سے انہیں زمانے کی اونچ نیچ سکھانا، انہیں اس تمدن میں اپنا کردار ادا کرنے کیلئے تیار کرنا تو ان کے پالنے پوسنے سے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ سامعہ اور ماہا کے لئے ان کے ماحول اجنبی ہیں اور عائشہ کیلئے ہمارا ماحول اور یہ اجنبیت صرف میں دور کر سکتی ہوں۔ عائشہ کے لئے اس گھر میں کشادگی پیدا کرنا اور فہد کو اس کی قدر دانی سکھانا، ان کے بچوں کو ایک پرسکون ماحول مہیا کرنا جہاں ان کی بہترین سیرت سازی ہو سکے۔

ہاں لمحہ موجود ہی سب سے اہم ہے......اس تمدن کی تعمیر میں اب مجھے اپنا انتہائی اہم رول ادا کرنا ہے۔

پھر لمحہ بھر میں انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا، اور اگلے روز وہ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ پروفیسر ڈاکٹر شفیع کمال کے کمرے میں اپنے استعفیٰ کے ساتھ داخل ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے استعفیٰ پر نظر ڈالی اور حیران ہو کر بولے۔

''میڈم یہاں تو آپ کے اعزاز میں ڈنر کی تیاریاں ہو رہی ہیں!''

مسز قائم خانی بہت اعتماد سے مسکرا کر بولیں۔ ''جی ڈاکٹر صاحب اس ڈنر پر تو میرا حق ہے۔ اس لئے کہ الوداعی ڈنر تو بہت اہم ہوتا ہے۔'' اور ڈاکٹر شفیع کمال مسکراتے ہوئے ان کی گاڑی تک الوداع کہنے آئے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مسز قائم خانی کی نظر ایڈمن بلاک کے ساتھ لگے ہوئے نیم کے درخت پر پڑی۔ شدید گرمی میں درخت پر موجود گھونسلے میں ننھے سے بچے کے منہ میں چڑیا دانہ ڈال رہی تھی اور دانہ ڈال کر بھی گرمی سے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اصل کردار تو مادہ کو ہی ادا کرنا ہوتا ہے اپنے نشیمن کی تعمیر میں یہ سوچ کر مسکراتے ہوئے انہوں نے گاڑی آگے بڑھا لی۔

☆......☆......☆

نبیلہ شہزاد

فاصلے

گھر بکنے کی خبر سن کر گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ پھر گھر بھی ایسا خوبصورت جسے خوابوں کا گھر کہا جا سکتا ہے۔ بحریہ ٹاؤن لاہور کے علاقے میں چار کنال کا بنگلہ سجا سجایا...... کہاں مل پاتا ہے اتنی جلد ایسا گھر۔ یہ اچانک کیا ہوا باؤ جی کو...... اکیلے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا گھر کے کسی فرد سے مشورہ تک نہیں کیا۔

بہو شائستہ دانتوں تلے انگلی دابے سوچتی ہی رہ گئی۔

بیٹا اکرم بھی پریشان تھا کہ لوگ تو بہتر لائف سٹائل کی طرف جاتے ہیں اور ایک ہمارے باؤ جی ہیں جنھوں نے چار کنال کا گھر چھوڑ کر پانچ مرلے کے گھر میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ساری زندگی پانچ مرلے کے گھر میں گزارنے کے بعد اگر خدا خدا کر کے اچھا اور بڑا گھر نصیب میں ہوا ہے تو یہ باؤ جی کو اچانک پتہ نہیں کیا دورہ پڑ گیا۔

اکرم مجبور تھا، باپ کے سامنے زیادہ بول بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ کاروباری حساب کتاب کی ساری کنجیاں باؤ جی نے اپنے ہاتھ میں ہی رکھی تھیں۔ اسے تو صرف ضرورت کے تحت خرچہ ہی ملتا تھا۔

پوتا ذیشان اور پوتی ماہ نور اپنی جگہ مغموم تھے۔ وہ دونوں بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو اپنی رہائش گاہ کا بتاتے اور ساتھ اپنی رہائشی علاقے کی خوبصورتی کا تذکرہ کرنا بھی نہ بھولتے۔

پریشان تو سب تھے لیکن بے بس تھے۔ اگر کوئی ہمت کر کے دبے دبے الفاظ میں باؤ جی سے گھر بیچنے کی وجہ پوچھتا تو کڑک دار آواز میں جواب ملتا۔

''میرے دل نے چاہا تھا کہ بڑا سا خوبصورت گھر بنواؤں۔ میں نے بنوالیا۔ اب میرے دل نے چاہا ہے بیچ دو، تو میں نے بیچ دیا۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟''

☆......☆......☆

باؤ جمیل اختر کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھیں سیلف میڈ کہا جاتا ہے۔ اس باہمت انسان نے اس آنگن میں آنکھ کھولی جہاں اہل خانہ کے ساتھ غربت کا بھی بسیرا تھا۔ باپ نے بچپن میں مزدوری میں ڈال دیا لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی اور ایف اے تک پڑھ لیا ان دنوں ایف اے تعلیم والوں کو گزارہ لائق سرکاری نوکری مل جاتی تھی پھر ان کا گزارہ تو اور زیادہ اچھا ہو جاتا تھا کیونکہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ بیٹے کی اچھی پرورش کی پڑھایا لکھایا۔ خود جاب کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی ریٹائرمنٹ لے لی اور اسی پیسے سے چھوٹی سی صابن بنانے والی فیکٹری لگالی۔

جہاں محنت اور ایمانداری ہو وہاں کاروبار ضرور ترقی کرتا ہے۔ باؤ جمیل کے کاروبار نے بھی خوب ترقی کی۔ صابن اچھی کوالٹی اور مناسب قیمت کے باعث ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔ اکرم نے تعلیم مکمل کی تو اسے بھی اپنے ساتھ ہی اپنے کاروبر میں لگا لیا۔ کاروباری بچت سے جائداد بنالی۔ پلاٹ خرید لیے لیکن گھر آبائی پانچ مرلے والا ہی رکھا بس ذرا ناپ تول کر اس کی ہلکی سی آرائش و زیبائش کر لی۔ جب کبھی اکرم بڑے گھر اور اچھے علاقے میں رہنے کی طرف توجہ دلاتا تو باؤ جمیل صاف کہتا۔

''اوئے لڑکے! نئی نئی دولت ہے...... آغاز میں ہی اتنی اونچی چھلانگیں لگانا اوچھا پن لگتا ہے۔''

پھر معلوم نہیں کیا سوجھی۔ خود ہی جا کر سوسائٹی بھی پسند کر لی اور پلاٹ بھی اور گھر والوں کو خوشخبری سنا دی۔ گھر تعمیر ہونے لگا۔ سب کی

خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ باؤ جمیل نے سب کی پسند کا خیال رکھا۔ بچوں سمیت سب کے الگ الگ کمرے بنے اور سب نے اپنی اپنی پسند کی ڈیزائننگ کروائی۔

بنگلہ نما گھر مکمل ہو گیا۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے گھر میں برکت کے لیے قرآن پڑھوایا گیا۔ یہ گھر سب کے خوابوں کی تعمیر تھا۔ اس گھر میں سب بہت خوش تھے لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ خوشی صرف ایک سال کی عارضی مدت کے لیے ان کے پاس رہے گی اور ایک سال بعد ان کا دل پسند گھر بک جائے گا اور غضب یہ کہ وجہ بھی سوائے باؤ جی کے کسی کو معلوم نہ تھی کہ گھر کیوں بیچا جا رہا ہے۔

☆......☆......☆

چھوٹے گھر سے بڑے گھر کی طرف سفر بہت آسان اور خوشگوار ہوتا ہے لیکن بحریہ ٹاؤن جیسی سوسائٹی میں سجی سجائی چار کنال کی خوبصورت کوٹھی میں رہنے کے بعد گوالمنڈی کی تنگ سی گلی میں جہاں اکثر بارش ہونے پر نالیاں ابلنے لگتی ہیں اور گلیاں کھیتوں کے درمیان بنے کاریز کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں، تو ایسی گلی میں پرانی طرز تعمیر کے بنے پانچ مرلہ گھر میں رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہ تو کوئی باؤ جمیل کی فیملی سے ہی پوچھے! سب سکتے کی حالت میں تھے۔ سوچ رہے تھے کہ اس گھر میں واپسی خواب ہے یا جو شاندار گھر میں ایک سال گزرا وہ خواب تھا۔ شاید باؤ جی نے اسی دن کے لیے یہ گھر بیچنے نہیں دیا تھا حالانکہ اکرم نے کئی بار اصرار بھی کیا کہ اس گھر کو بیچ دیا جائے۔ اب اس کو رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟ لیکن باؤ جی نے ہمیشہ اکرم کو یہ کہہ کر چپ کروا دیا کہ اس گھر سے میرے ماضی کی یادیں وابستہ ہیں، میں اپنے ماضی کی یادوں کو بیچ نہیں سکتا۔ اور اب جبکہ سارے گھر والے پریشان تھے تو باؤ جی مسرور و مطمئن شاید اس وجہ سے تھے کہ اپنے ماضی کی یادوں میں واپس آ گئے تھے۔

واپسی کی پہلی صبح باؤ جی کے لیے کتنی پر مسرت صبح تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے چھوٹے سے صحن میں گنگناتے ہوئے ٹہل رہے تھے اور ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے اپنی فیملی کے سوجھے چہرے دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ فیملی بھی مجبور و بے بس کہ باؤ جی کی اطاعت فرماں برداری لازم، حکم عدولی کی کسی میں جرأت نہ تھی کہ سب ان کے رحم و کرم پر تھے۔

باؤ جی نے آواز لگائی ''میرے بچو! سارے ادھر صحن میں میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' اس آواز پر سارے بے دلی سے ٹانگیں گھسیٹتے آ کر بیٹھ گئے کہ پتہ نہیں اب کون سا نیا حکم صادر ہونے کو ہے۔

باؤ جی مسکراتے ہوئے سب سے مخاطب ہوئے۔

''میرے بچو! میں جانتا ہوں کہ آپ سب لوگ اس نئے فیصلے سے خوش نہیں ہیں لیکن میں نے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ آپ لوگ کیا جانیں کہ میں نے اس بڑے سے گھر میں ایک سال کتنی مشکل سے گزارا ہے۔ جب تک میری زندگی ہے میں تو تمھیں ساتھ لے کر اسی گھر میں رہوں گا میرے بعد جو جی چاہے کرنا۔ بڑے گھر میں ہماری عادتیں بھی بڑے لوگوں جیسی بن گئی تھیں۔ تین تین چار چار دن مسلسل میں اپنے پوتی پوتے کی شکل نہ دیکھ پاتا۔ میرا بیٹا جو میرے بغیر کھانا نہ کھاتا تھا اس کی یہ عادت وہاں ختم ہو گئی۔ ہر کوئی اپنے کمرے میں اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ ہمارے درمیان اجنبیوں کی طرح رسمی سلام دعا رہ گئی یا پھر اپنے اپنے کام کی بات۔ ادھر گھر چھوٹا ہے، ایک فرد کی کی گئی بات پورے گھر میں سنائی دیتی ہے۔ کوئی کسی سے چاہتے ہوئے بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ ایک ہی جگہ سب نے بیٹھنا اور اکٹھے کھانا ہوتا ہے۔ میں نے تو اپنے اس تجربے سے یہی سبق سیکھا ہے کہ رہائش میں دوری دلوں میں بھی دوری پیدا کر دیتی ہے۔''

شرمندگی سے سب کی نظریں جھک گئیں کیونکہ باؤ جی اپنی بات میں سو فیصد سچے تھے۔

☆......☆......☆

عالیہ شمیم

بڑائی

''تو پھر کیا سوچا آپ نے؟''

سارہ نے اخبار میں مصروف اپنے شوہر سے کہا

''بھئی کس بارے میں؟'' غائب دماغی سے جواب آیا

''افوہ میں تو آپ کے اس شغل سے تنگ آ گئی ہوں، اس اخبار نے تو آپ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا ہے، شادی میں چند ہی دن رہ گئے ہیں کیا تیاری نہیں کرنی؟''

''کیا مطلب کیسی تیاری؟ کیسی باتیں کرتی ہو، یہ تیاری شیاری تو تم عورتوں کے کام ہیں۔ بھلا کیا مجھ کو پارلر جانا ہے یا کپڑوں پر کام بننے دینا ہے؟ انتظامات ہو چکے ہیں، فرنیچر والے کو میں آرڈر دے چکا ہوں، کلب بک ہو چکا ہے اب کیا تیاری کرنی ہے؟'' رحیم صاحب نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''ماشاءاللہ کیا سوچ ہے! کیا شادی کے نام سے یہی کچھ ذہن میں آتا ہے؟ میرا مطلب تھا کہ آپ نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں میں سے جو جو آپ سے ناراض ہے کیا اس کو منا لیا ہے؟''

جمیلہ بیگم نے گویا اپنے میاں کی دکھتی رگ چھیڑتے ہوئے کہا

''دیکھو میں تم کو بارہا منع کر چکا ہوں تم بار بار بہانے سے یہی موضوع چھیڑ دیتی ہو۔ میں بھائی جان کا نام تک سننا پسند نہیں کرتا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''آپ نے کیوں ضد پکڑ لی ہے؟ کبھی ناخنوں سے ماس بھی جدا ہوا ہے؟ ان کی کرنی ان کے ساتھ، کم از کم آپ تو قطع تعلق نہ کریں۔ رحم کے رشتوں کا بہت حق ہے، ساری عبادتیں ریاضتیں بھی اس وقت تک قبولیت کا درجہ نہیں پاتیں جب تک بندوں کے حقوق پورے نہ کیے جائیں''

''ہاہ۔۔۔تم بھول چکی ہو سارہ لیکن میں نہیں بھولا، آج بھی میرا دل لہولہان ہے، روپیہ پیسہ، جائیداد چلو یہ سب تو مادی چیزیں تھیں جو انہوں نے مجھ سے چھین لیں مگر ماں باپ جیسی دولت کو انہوں نے مجھ سے متنفر کر کے جو کاری وار کیا ہے اس کو تو میں تمام عمر نہیں بھلا سکوں گا۔ میری ماں میری نہیں رہیں۔۔۔ابا مجھ کو دیکھتے ہی رخ موڑ لیتے ہیں یا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔۔۔نہیں جمیلہ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا ہے اب اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کرنا۔''

ہمیشہ کی طرح رحیم صاحب طیش میں آ کر باہر جا چکے تھے اور پیچھے جمیلہ بیگم اپنا دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ابھی ان کے شوہر جس سخت دلی کا مظاہرہ کر گئے ہیں درحقیقت اندر سے خود ان کا دل اپنے والدین اور بھائیوں کی یاد میں سلگ رہا ہوگا مگر محض انا کا بت ان کے قدموں کو روک رہا تھا جبکہ شادی میں اب چند ہی دن رہ گئے تھے۔ کارڈ بانٹنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جمیلہ بیگم کی حد سے زیادہ یہی خواہش تھی کہ روٹھے ماں باپ بھائی کو منا لیا جائے مگر ماضی میں ہونے والی اپنے اوپر زیادتیوں کو رحیم صاحب بھلا نہیں پائے تھے اور اسی بات کو دل میں لیے انہوں نے سب سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اپنے گھر کی کسی بھی تقریب میں بلانا تو درکنار ان کو عیادت و تعزیت کے لیے بھی ملنا گوارا نہیں تھا۔ شریک حیات ہونے کے ناطے سارہ بیگم اچھی طرح جانتی تھیں کہ باہر سے سخت دلی کا مظاہرہ کرنے والے ان کے شوہر کا دل اندر سے کتنا والدین کی محبت سے بھرا ہوا ہے۔ ان کو اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ عین نکاح کے وقت کہیں دل میں چھپا غم درد کی صورت میں دورے کا باعث نہ بن جائے۔ اس سے قبل بھی انجائنا کی تکلیف ہو چکی تھی جس کی وجہ تمام ڈاکٹرز نے ذہنی پریشانیاں ہی بتائی تھی۔

''میں کہتا ہوں پہلی بار ہی کیوں سگریٹ سلگائی، تم نے سوچا بھی کیسے کہ میرے بیٹے ہو کر تم یہ شوق پالو گے، حلیہ دیکھا ہے اپنا، کہیں سے بھی رحیم الدین کے بیٹے نہیں لگ رہے، کون سے دوست پال لیے ہیں تم نے؟ غصے میں وہ اپنے بیٹے کو بہت کچھ کہہ گئے تھے اور اس دوران اس

کی طرف سے بار بار معذرت سن کر ہی نہیں دے رہے تھے۔رات رسم مایوں کے بعد نو جوانوں کا ٹولہ ان ہی کے گھر رک گیا تھا اور جب ہی اپنے بیٹے اسد کو سگریٹ پیتا دیکھ کر رحیم صاحب اپنا ضبط کھو بیٹھے تھے۔کئی بار وہ اس کو اسکن ٹائٹ جینز پر ٹوک چکے تھے جو بے انتہا نیچی بندھی ہونے کے باعث پائنچوں پر سے گھس چکی تھی اور ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، پندرہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور اس طرح سگریٹ پی رہا تھا جیسے پتہ نہیں کتنا ماہر ہو،سوچ کر ہی ان کا خون کھولنے لگا تھا۔قبل اس کے کہ وہ مہمانوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر اس پر ہاتھ اٹھا لیتے ،سارہ بیگم آڑے آ گئی تھیں اور سامنے سے اسد کو ہٹا لیا تھا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں، مانتی ہوں اس نے غلط حرکت کی تھی مگر اس طرح مہمانوں کے سامنے آپ کو ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا، جوان خون ہے،اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا بیٹھے، کہہ رہا تھا کہ بابا نے دوستوں کے سامنے انسلٹ کی ہے۔۔۔سگریٹ تو اب خود بڑے بھی پیتے ہیں میں نے کون سا حرام شے پی تھی۔''

''ہاں اب تم آ جاؤ اس کی طرفداری کرنے۔۔۔ ہر برائی اسی وقت اپنا براپن کھو بیٹھتی ہے جب اس کے لیے تاویلات نکالی جانے لگیں ،آجکل تو اور بھی بہت کچھ ہو رہا ہے تو یہی سوچ کر اپناتے جاؤ کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔''ان کا غصہ دوبارہ عود کر آیا تھا۔''اس نے کیا کبھی مجھ کو دیکھا ہے پیتے ہوئے۔اپنے دادا، تایا کو دیکھا ہے؟، ہمارے خاندان میں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔اس کی ہمت کیسے ہوئی باپ دادا کی عزت داؤ پر لگانے کی۔اور ڈھٹائی تو دیکھو۔مجال ہے جو اپنی غلطی تسلیم کر لے،الٹا اوندھے اوندھے جوابات دیے جا رہا تھا۔''

''ارے رحیم صاحب معمولی غلطی کو اتنا انتہا تک نہ لے جائیں آپ علیحدگی میں بھی تو اس کو سمجھا سکتے تھے نا۔میں تو بس یہی کہنا چاہ رہی تھی کہ دوستوں کے سامنے نہ ڈانٹتے اور رہی بات اپنے خاندانی وقار کی۔تو معاف کیجیے گا، بہت معذرت کے ساتھ۔کونسا خاندان؟ آپ سے کتنا کہا کہ آپ کم از کم دعوت تو دے دیں مگر آپ نے تو خود ہی قطع تعلق کر لیا، کہاں ہیں دادا، تایا۔کس کو شریک کیا ہے آپ نے؟ مانا کہ انہوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی تھی مگر آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی مدد سے میں آج بھی پھل پھول رہا ہوں ورنہ میرے اپنوں نے تو مجھ کو گویا سڑک ہی میں کھڑا کر دیا تھا۔ان کی کرنی ان کے ساتھ مگر بدلے میں آپ نے قطع تعلق ہی کر لیا۔آج اسد کو سگریٹ پیتا دیکھ کر آپ کو خاندان کی ناموس باپ دادا کی عزت کا خیال آ گیا مگر ذرا سوچیں۔'' سارہ بیگم کی آواز رندھ گئی۔

''آقائے دو جہاںؐ نے اپنی ذات کو کبھی مقدم نہیں رکھا، اپنی طرف اٹھنے والے ہر حملے کو۔روح پر لگائے گئے ہر چرکے کو۔صرف اللہ کی محبت میں خوش دلی سے سہا،اس کے دین کے نفاذ کے لیے اپنی ذات کو فراموش کر لیا، کبھی بدلہ نہ لیا، نہ ہی قطع تعلق کیا۔۔۔تو میں اور آپ کس گنتی میں ہیں؟ اولاد کی صحیح تربیت بے شک ہر والدین کے لیے لازمی ہے مگر حکمت و تدبر کے ساتھ۔اپنی اولاد کو خود سے دور کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ جس رویے کا گلہ آپ کو اپنے والدین سے ہے، اپنی اولاد کے لیے کیوں وہی راستے ہموار کر رہے ہیں آپ؟''

اب سارہ بیگم ضبط کھو چکی تھیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بیوی کو اسطرح روتے دیکھ کر رحیم صاحب نادم ہو کر خاموشی سے باہر چلے گئے تھے۔

ان کے دل میں ابال اٹھنے لگا تھا۔واقعی اس نہج پر تو انہوں نے سوچا ہی نہ تھا! غصے اور بدلے کی آگ میں والدین کے حقوق، حسن سلوک، چھوٹوں پر شفقت، رحم دلی و فیاضی، برداشت، صبر اور حکمت۔ان اوصاف کو وہ داؤ پر لگا چکے تھے اور مظلومیت کا پرچار کیے اپنے آپ کو خود اذیتی میں مبتلا کر چکے تھے۔کبھی انہوں نے والدین کو منانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، یہی سوچ ان پر حاوی رہی کہ ماں باپ کا محتاج نہیں ہوں اپنے پیروں پر خود بھی کھڑا ہو سکتا ہوں، اور اس سے بھول چکے تھے کہ والدین کی دعاؤں کے تو وہ ساری عمر محتاج ہی رہیں گے، وہ تو ماں کا ایک رات جاگنے کا بھی حق ادا نہیں کر سکتے۔ان پر افسوس اور پچھتاوا چھانے لگا۔اور ندامت کا یہ لمحہ اتنا طاقتور ضرور تھا کہ اس کے زیر اثر وہ اپنے قدموں کو والدین کے گھر کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پائے تھے۔اب بھی دیر نہیں ہوئی تھی۔وہ والدین کی دعاؤں کی چھاؤں میں بیٹی کو رخصت کر سکتے تھے۔

☆......☆......☆

نیلوفر اقبال

سیاہ سونا

حکومت والے ابھی آرام سے بیٹھے ہی تھے۔ ہر محاذ پر الو قریب قریب سیدھا ہوا ہی تھا۔ حتیٰ کہ راوی بھی چین لکھنے ہی والا تھا کہ یکلخت ستم یہ ہوا کہ اخباروں میں ہلچل مچ گئی۔ پہلے صفحے پر قحط کی سرخیاں لگنے لگیں اور ساتھ مرتے ہوئے بچوں کی تصویریں لگنے لگیں۔ اس ناگہانی صورت حال سے کھاتے پیتے ایوانوں میں بے چینی پھیل گئی اور سکون برباد ہو گیا ...... ان تک پیغام پہنچنے لگا کہ جرنلزم والوں کی اس (جارحانہ) یلغار کے جواب میں انھیں کچھ نہ کچھ نہیں بلکہ خاصا ردعمل دکھانا ہے۔ جس میں سب سے اہم اور فوری اقدام تھا، بیان دینا اور پھر اگلے چند دنوں کے اندر اندر متاثرہ علاقے میں از خود پہنچنا یعنی اس کا دورہ کرنا...... جو زیادہ ہیلی کاپٹر اور کچھ نہ کچھ زمین پر ہوتا ہے۔ جس میں ہسپتال جانا، ڈاکٹروں سے مرتے ہوئے بچوں کا حال پوچھنا اور مکمل حکومتی تعاون اور کوئی کسر نہ چھوڑے رکھنے کا اعلان کرنا اور پھر کسی مریض کے بستر کے پاس نہایت افسردہ اور قریب قریب رو دینے والی صورت بنا کر تصویر بنوانا اور پھر سینیٹائزر (Sanitizer) کے ساتھ ہاتھ صاف کر کے واپس آنا اور آخر میں مناسب لوگوں کی مناسب اقدامات کا حکم دینا شامل ہے...... تب کہیں جا کر اللہ خیر صلا کی نوبت آتی ہے۔

ایک اہم حکومتی عہدیدار کو بہت غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ ان اخبار والوں کی ایسی کی تیسی کر دے جو معاملات کو ''آؤٹ آف پروپورشن'' اچھال کر بدامنی پھیلا دیتے ہیں اور ساری صورت حال کا (جو کہ دراصل قدرتی آفت ہے) ذمہ دار بے چارے حکومت والوں کو ٹھہراتے ہیں اور خواہ مخواہ غیر ذمہ داری اور بے حسی کا الزام لگاتے ہیں۔ اس نے غصے سے بڑبڑا کر کہا۔ ''کیا ہم نے قحط ڈالا ہے؟ ہم نے مارے ہیں ان کے بچے؟'' پھر اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ فرض کرو یہ چیتھڑا سا بچہ (جس کی ڈرپ کی نلکیوں کے ساتھ تصویر چھپی ہے) نہ بھی مرتا تو زندہ رہ کر اس نے کون سا تیر مار لینا تھا۔ بننا تو وہی تھا جو اس کے بڑے بنے ہیں۔ کون سا پینٹ شرٹ پہن کر انگریزی سکول جانا تھا...... لیکن یہ اس نے صرف دل میں سوچا۔ بڑبڑایا بالکل نہیں کیونکہ دیواروں کے بھی کان ...... نہیں بلکہ ان میں خفیہ کیمرے اور مائیک ہوتے ہیں۔ پھر وہ یہی سب کچھ سوچتا اور کڑھتا ہوا اسی سلسلے میں ہونے والے ایک اہم اجلاس میں شرکت کے لیے اپنی سرکاری گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اہم اجلاس میں بہت سے فیصلے ہوئے۔ فوری اقدام کے طور پر امدادی ٹیمیں متاثرہ علاقے میں بھیجنے کا حکم جاری ہوا۔

امدادی ٹیم کے ٹرکوں کے کونوئے کے ہمراہ جانے والی گاڑی میں چند ذمہ دار افراد سوار تھے۔ ان کے ذمے سامان کو آفت زدہ علاقے میں بخیر و خوبی پہنچانا اور خوش اسلوبی کے ساتھ تقسیم کرنا تھا۔ اس گاڑی میں سوار افراد میں ایک کا نام فہیم تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور بے چین طبیعت کا مالک تھا۔ فالتو وقت میں سوچ بچار بھی کر لیتا تھا بلکہ اسے سوچنے کی بیماری تھی۔

سفر لمبا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب دور دور تک خشک زمین اور افق تا افق صحرائی علاقہ تھا۔ نباتات برائے نام تھیں۔ کوئی میلا کچیلا لاغر اونٹ یا چادر میں ڈھکی عورت یا پھونس کی جھگیاں کسی کی توجہ کیا کھینچتی۔ منظر میں اکتاہٹ پیدا کر دینے کی حد تک یکسانیت تھی۔ توجہ بٹانے والی کوئی بھی چیز نہ تھی، لہٰذا فہیم کے پاس سوچنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا اور وہ سوچ رہا تھا...... وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کوراک سے بھرے ٹرک مذاق نہیں تو کیا ہیں...... اک سنگین مذاق جہاں یہ ٹرک جا رہے ہیں، بچہ بچہ جانتا ہے کہ اس زمین کے اندر دنیا کے عظیم ترین خزانوں میں سے ایک موجود

ہے...... ’’بلیک گولڈ‘‘ کا خزانہ...... گو یہ لفظ سیال دولت کے لیے مستعمل ہے لیکن اس سیاہ پتھر کے لیے زیادہ موزوں ہے جو یہاں زیرِ زمین دور دور تک پھیلا ہے...... آج سعودی عرب کو دیکھو۔ ایران کو دیکھو اسی دولت نے ان کی قسمتیں بدل دیں لیکن اس خزانے کو نکالنے کے لیے آدمی چاہیے...... افسوس آدمی تو تھے لیکن ان کے پاس طاقت نہ تھی۔ سوچ نہ تھی۔ ان کی تو اپنی بقا کا دارومدار ہی دوسروں پر تھا۔ شاید یہ محض چھوٹے بڑے ٹھیکے دینے پر ہی قادر تھے۔ قسمتیں بدلنے پر نہیں...... نتیجہ یہ نکلا کہ آج خوردنی سامان سے بھرے ٹرک ان کے لیے جا رہے ہیں جن کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی ان کے مسئلے کا مستقل حل نہیں سوچتا۔ آج وہ جو عزت سے روزی کما رہے تھے، بھوک اور غربت کی آخری پستیوں میں دھنس گئے۔ جن مویشیوں پر ان کی روزی کا دارومدار تھا، وہ مرتے جا رہے تھے اور اب ان کے بچے بھی مر رہے ہیں۔ مرکز والوں کو تو چھوڑو، کیا ان کی اپنی حکومت والے اندھے تھے؟ کیا ہونے والا ہے، کیا برسوں سے نظر آ رہا تھا؟ اس خزانے کو نکالنے کا تھوڑا بہت کام بھی شروع ہو جاتا تو انھیں روزگار مل جاتا۔ ایک دن یہ دولت مند بھی ہو جاتے اور طاقتور بھی...... شاید یہی اصل وجہ ہو اس تاخیر کی...... فہیم محض سوچ سکتا تھا اور وہ سوچے جا رہا تھا۔ سفر لمبا تھا، سوچنے کے لیے وقت ہی وقت تھا۔

کونوائے اپنے ہدف کے نزدیک پہنچا تو قحط زدہ علاقے میں موجود کیمپ سے رابطہ کیا گیا۔ طے پایا کہ سامان پہنچ جانے کے بعد ضرورت مند خاندانوں کو بلوا لیا جائے گا۔ گھنٹوں کے سفر سے سب تھک چکے تھے۔ راستے میں آنے والے ایک قصبے کے چھوٹے سے ہوٹل میں تازہ دم ہونے کو رک گئے۔ ’’سڑک کنارے کے ہوٹلوں کے کھانے میں ایک خاص بانکپن اور چائے میں ایک خاص لذت کیوں ہوتی ہے۔‘‘ فہیم نے چائے کے کافی میٹھے اور گرم پیالے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچا۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے پڑاؤ کے بعد وہ آگے روانہ ہو گئے۔

تنگ سی سڑک پر کچھ ہی آگے ایک دوشاخے سے کچھ پہلے انھیں ناکہ بندی ملی۔ چند مستعد سے آدمی گویا انہی کے منتظر تھے۔ وہ روکنے کے اشارے کرتے ان کی طرف لپکے۔

’’ٹرک ادھر شہر کو جانے والی سڑک کو موڑ دو۔ یہ ہمارا بندہ ساتھ جائے گا۔ سیدھا گیسٹ ہاؤس پہنچا دے گا۔‘‘ ایک اہم سے اہلکار نے ٹرکوں کو گویا ہانکتے ہوئے کہا۔

کونوائے کا انچارج گاڑی سے اتر آیا۔ اس کے چہرے پر تذبذب تھا۔

’’لیکن سامان کا تو اندرون میں متاثرہ علاقے میں انتظار ہو رہا ہے۔ کیمپ لگا ہے اُدھر۔‘‘

’’ہر کام طریقے سے ہوتا ہے۔‘‘ اہم اور چاق و چوبند اہلکار نے کہا۔ ’’ایسے لے کر جاؤ گے تو غریب غربے لوٹ مار کر دیں گے۔ ادھر گیسٹ ہاؤس میں وزیرِ اعلیٰ نے آنا ہے۔ اخبار والے بھی آئیں گے...... کام طریقے سے ہو جائے گا۔ سمجھے کہ نہیں؟‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے بھائی۔ پر سامان میں خوراک ہے، جان بچانے کی چیزیں ہیں۔ کل پرسوں تو بہت دیر ہو جائے گی۔‘‘ انچارج نے کہا۔

’’تم میری بات سمجھ نہیں رہے۔ کوئی طریقہ ہوتا ہے کام کرنے کا۔ وزیر کے ہاتھوں سے سامان بٹے گا تو سو ہزار آدمی دیکھے گا۔ ایسے ہی لے جاؤ گے تو مویوں نے دیکھنا ہے۔ بات سمجھے کہ نہیں؟ کام کرنا ہے تو طریقے سے کرو۔‘‘

’’طریقے سوچتے سوچتے تو ادھر پتہ نہیں کتنی خلقت مر جائے گی۔‘‘ انچارج خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ ’’ہمیں فوری سامان پہنچانے کا حکم ہے۔ میں کیا جواب دوں گا سیکرٹریٹ والوں کو۔ آخر ہم بھی جوابدہ ہیں۔‘‘ وہ بار بار سیل فون پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔

’’چلو پھر ایسا کر لو۔ نہ تمھاری بات نہ میری بات۔ آدھے ٹرک آگے لے جاؤ، آدھے ادھر موڑ دو۔ وزیرِ اعلیٰ کا معاملہ ہے ہم بھی جوابدہ ہیں۔‘‘ وہ مصالحانہ انداز میں بولا۔

فوراً ٹرکوں کی گنتی ہوئی۔ آدھے اندرون صحرائی علاقے کی طرف ہانک دیے گئے اور آدھے نسبتاً صاف سڑک کو موڑ دیے گئے۔ امدادی ٹیم کے مضطرب ارکان شہر کو جانے والے ٹرکوں کو دور نظروں سے اوجھل ہوتا

دیکھتے رہے۔ تمام افراد کا متفقہ خیال تھا کہ اس سامان کے انجام کی خبر تو شاید اب وزیراعلیٰ کے فرشتوں کو بھی نہ ہو پائے گی۔ سڑک خستہ حالت میں تھی۔ دونوں جانب دور تک ریتلی زمین تھی۔ کہیں کہیں پھونس کی گول چھتوں والی جھونپڑیاں یا کوئی بدرنگ سی کھال والا مریل اونٹ نظر آ جاتا۔ شام سے کچھ پہلے وہ مقرر کردہ جگہ پر پہنچ گئے۔ ایک چھوٹی سی زرد چونے سے لپی عمارت تھی جس کے سامنے احاطہ تھا۔ علاقہ کے سرکردہ لوگ ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ایک کمرے میں بٹھانے کا انتظام تھا۔ وہاں کچھ کرسیاں تھیں اور ایک میز پر پینے کا پانی اور چائے کا سامان تھا۔

''پہلے چاؤ پیو۔ تازہ دم ہو جاؤ۔ آگے کافی کام پڑا ہے۔''

استقبال کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ وہ چائے کے کپ بنا کر سب کو پیش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا تعارف اصلاحی کمیٹی کے رکن کے طور پر کروایا۔ وہ بار بار آنے والوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

فہیم اپنا چائے کا کپ لے کر دروازے میں آ کھڑا ہوا اور باہر کے منظر کا جائزہ لینے لگا۔ ٹرکوں کے ڈرائیور درختوں کے سائے میں مونڈھوں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ فہیم کو ٹرکوں کے قریب لوگوں کا مجمع نظر آیا جو لحہ بہ لحہ بڑھتا ہوا ہجوم کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس میں مٹیالے کپڑوں میں ملبوس مرد، رنگین گھاگھروں اور چادروں میں چھپی عورتیں۔ جن کے سانولے بازوؤں پر کہنیوں سے اوپر تک سفید چوڑیاں چڑھی نظر آتی تھیں۔ خدا جانے یہ چوڑیاں کس چیز کی علامت ہیں۔ فہیم نے سوچا اور اتنی غربت میں بھی ان عورتوں نے یہ بھاری لباس کہاں سے لیے۔ ہاں شاید کوئی مرد جب اپنی بھیڑ بکریاں فروخت کرنے میں کامیاب ہوتا ہوگا تو اپنی عورت کے لیے یہ رنگدار کپڑے اور چوڑیاں خرید کر لانا ہی اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کا سامان ہو...... کیونکہ اور تو کوئی ساز و سامان نہیں بس ریت ہی ریت ہے......

قدرے معتبر نظر آنے والے آدمی نے جس نے خود کو اس علاقے کی اصلاحی کمیٹی کا رکن بتایا تھا، مجمعے کی بے چینی کو بھانپتے ہوئے اور ہجوم کو بتدریج ٹرکوں کی جانب بڑھتے دیکھ کر بلند آواز میں کہا: ''سامان بہت ہے۔ سب کو ملے گا۔ ان شاء اللہ۔ اب سب لوگ قطار بناؤ اور باری باری آگے آؤ۔'' دو آدمی آگے بڑھے اور ہجوم کو قطار میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ انچارج کے اشارہ کرنے پر سب سے پہلے ٹرک پر سوار کارندے بنڈل زمین پر اتارنے لگے۔ انھوں نے آٹھ دس بنڈل اتارے تھے کہ یکا یک ہجوم میں بھونچال آ گیا۔ تب بہت سے لوگ اکٹھے ٹرکوں کی جانب دوڑے اور فی الفور چھینا جھپٹی کا عالم شروع ہو گیا۔ کچھ لوگ ٹرکوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس اچانک یلغار سے ٹرکوں پر موجود کارندے بوکھلا گئے اور تیزی سے سامان نیچے پھینکنے لگے بلکہ ہجوم کے اوپر پھینکنے لگے۔ پھر پھینکنے والوں اور وصول کرنے والوں میں فرق مٹ گیا۔ تب چاروں جانب سے لوگ ٹرکوں پر چڑھ گئے اور تاک تاک کر نیچے اپنے خاندان کے لوگوں کی جانب بنڈل اچھالنے لگے اور کھینچا تانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ہی آٹے کی بوری کو کھینچتی ہوئی دو عورتیں زمین پر گتھم گتھا ہو گئیں۔ بہت سے بنڈل پھٹ گئے اور لوگ ان میں سے نکلے چھوٹے پیکٹ سمیٹتے نظر آنے لگے۔ زمین پر چینی اور دالیں بکھر گئیں۔ آٹے کی دھول اڑی اور غبار پھیل گیا...... پھر یہ ہوا کہ زمین کے اندر سے، درختوں سے، جھاڑیوں سے غول کے غول انسان نکل آئے اور ایک ایک بوری کے لیے آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ امدادی ٹیم کے افراد اور علاقے کی کمیٹی کے ارکان صورت حال بھانپ چکے تھے، لہٰذا لاتعلق ہو کر ایک طرف ہٹ گئے۔ کسی نے سگریٹ سلگا لیا۔ کوئی آدھی پی سوڈے کی بوتل ختم کرنے لگا اور وہ آپس میں ملک کی عمومی سیاسی صورتحال اور کرکٹ کے سکور وغیرہ پر گفتگو کرنے لگے۔

امدادی ٹیم کے کارکن فہیم نے جو باقیوں کی نسبت پڑھا لکھا تھا اور جسے سوچنے کی بیماری تھی۔ اپنے قریب سے ایک چھوٹے سے بچے کو اپنی کمر پر اپنے سائز سے بڑی بوری لادے گزرتے دیکھا اور سوچنے لگا کہ آخر کتنے دن چلے گی یہ بوری۔ یہ دالوں کا پیکٹ، یہ خشک دودھ...... پھر ...... پھر...... اس کے بعد؟ ایک چھوٹی سی بچی کو خشک دودھ کا پیکٹ سینے سے چمٹائے دیکھ کر اس نے سوچا کہ سینکڑوں میل دور سے دھکے کھاتے، خجل خوار ہوتا میں (چغد) اس لیے آیا کہ تھر پارکر کی ایک لڑکی کو دودھ کا

ایک پیکٹ دوں؟

قحط زدہ علاقے کے اندرون میں جھگیوں میں بسنے والوں میں سے ایک مرد نے جو سالم بنڈل اچکنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اسے اپنی پیٹھ پر لادا۔ اس کے پیچھے آتی گھاگھرے میں ملبوس اور چادر میں لپٹی اس کی بیوی اور پیچھے پیچھے آتے بچوں کے ہاتھوں میں بساط بھر سامان تھا۔ اس کا چھ سالہ لڑکا روتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے بازو پر چوٹ آ گئی تھی۔ بڑا لڑکا بھی پھینکی جانے والی آٹے کی بوری سر میں لگ جانے کی وجہ سے پریشان تھا لیکن خوش قسمت تھا کہ اس نے کئی پیکٹ سمیٹ لیے تھے۔ آٹھ سالہ لڑکی منمناتی آواز میں شکوہ کر رہی تھی کہ اس کا چاول کا پیکٹ ایک عورت نے اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔

''اللہ کرے موئے'' اس نے عورت کو بددعا دی۔ فہیم دلچسپی سے اس خاندان کو دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ چھوٹا لڑکا رونا بھول کر ایک گول پتھر کو گیند کی طرح ٹھوکر مار کر چل رہا تھا۔ اس کے بازوؤں کے حصار میں کچھ پیکٹ تھے۔ ایک پھسل کر گر پڑا۔ لڑکا بے خبر پتھر کو ٹھوکر مارتا آگے بڑھ گیا۔ فہیم کو اس خاندان کے اس معمولی پیکٹ کی قیمت کا احساس تھا، اس نے پیکٹ اٹھا لیا۔ پہلے تو وہ بچے کو پکارنے لگا لیکن اس خاندان کو جھونپڑیوں کے جھرمٹ کی طرف بڑھتے دیکھ کر اسے ان جھگیوں کو قریب سے دیکھنے کا تجسس ہوا اور وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔

وہ راستے بھر چھوٹے چھوٹے احاطوں کے ساتھ بنی اسی شکل کی جھگیاں دیکھتا آیا تھا۔ ان کے اندر کیا ہے، وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ذرا سی آڑ میں کھڑے ہو کر اس نے اندر جھانکا۔ اسے دیکھے جانے کا ڈر نہ تھا کیونکہ اس کی موجودگی کا جواز پیکٹ کی صورت اس کے پاس تھا۔

مرد نے آٹے کی بوری ایک کونے میں پھینکی۔ باقی سب نے بھی اپنا لایا ہوا سامان اس کے گرد اگرد رکھ دیا۔ عورت فوراً چولہا جلانے کی فکر میں نظر آئی۔

ایک دیوار کے ساتھ لگے بوسیدہ سے بستر پر تین سال کا چھوٹا بیمار سا لڑکا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار سے ٹیک لگائے بوڑھی عورت آدھی جاگی آدھی سوئی مندی مندی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ مرد بوری رکھ کر مڑا تو فہیم جلدی سے دروازے کے ایک طرف دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ فہیم نے سوچا کہ اب اپنی موجودگی ظاہر کر کے پیکٹ ان کے حوالے کر دے۔ اس نے دروازے سے جھانکا تو مرد جھونپڑی کے وسط میں ساکت کھڑا تھا۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ وہ خاموش لیکن بے چین سا لگ رہا تھا۔ فہیم آواز دینے ہی والا تھا کہ وہ اونچی آواز میں بولا:

''عجیب بات سنی ہے...... اب پتہ نہیں سچ ہے کہ جھوٹ۔''

''کون سی بات؟'' اس کے پیچھے چولہے کے پاس بیٹھی عورت کام کرتے کرتے رک گئی۔ فہیم بھی ٹھٹک کر رک گیا اور ہٹ کر دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔

''ادھر بات کر رہے تھے...... جو سامان لائے تھے۔ آپس میں بات کر رہے تھے کہ جن کے بچے موئے ہیں انھیں پانچ پانچ لاکھ روپے دیں گے......''

''ہیں؟'' عورت کے منہ سے حیرت کی آواز نکلی۔

''خود سنا میں نے......''

''ایسے ہی دے دیں گے ...... ہر کوئی کہہ دے گا ہمارا بچہ مویا ہے۔'' عورت کی آواز آئی۔

''وہ کوئی ویلے نہیں جو اٹھا کے مفت کے پیسے دے دیں گے...... ہسپتالوں سے پڑتال کریں گے۔''

عورت چپ ہو گئی۔ مرد کچھ دیر گویا اضطراب کے سے عالم میں کھڑا رہا۔

''......پھر تو اچھا ہی رہا میرو......'' وہ بولا۔

''کون میرو؟'' بوڑھی عورت کی آواز آئی۔

''وہ جس کا لڑکا مویا پچھلے ہفتے ہسپتال میں۔ ادھر تیسری جھگی والا ......اب تو لے گا ٹیکسی...... بڑی خوابیں دیکھتا تھا شہر جانے کی...... ساتھ ہی تھا جب بات سنی۔ بڑی رونق آ گئی تھی اس کی شکل پر......'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

''ابا کتنے ہوتے ہیں پانچ لاکھ؟'' بڑے لڑکے نے پوچھا۔

''بہت''۔آدمی زخمی لہجے میں بولا۔

''بندہ سوکام شروع کر لیتا ہے......زندگی بن جاتی ہے......اس میرو کو تو راس آ گیا مویا لڑکا۔''

کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر بوڑھی عورت کی آواز آئی۔

''ساروں کی قسمت ایک جیسی نہیں ہوتی......''آنکھیں میچے میچے اس نے ہوکا سا بھرا۔

فہیم کا جسم جیسے برف کی سل کے نیچے سن ہو گیا۔ اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ جھگی میں چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔ صرف دیگچی میں عورت کے چمچہ ہلانے کی آواز آئی۔ پھر وہ زیر لب مدھم سی آواز میں بڑبڑائی۔

''اللہ خیر رکھے میری اولاد کی......شکر ہے رب کا میرا بچہ ہسپتال سے واپس آ گیا......''

فہیم نے دیکھا کہ سب کی نظریں بیمار مریل بچے کی طرف اٹھ گئیں جو ہسپتال سے زندہ واپس آ گیا تھا۔ پھر وہ نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ فہیم نے دال کا پیکٹ دروازے کے ساتھ ہی رکھ دیا اور تیزی سے امدادی کیمپ کی طرف چل پڑا۔ ٹرکوں میں اب کچھ نہ بچا تھا۔ جس کو جو ملنا تھا، مل گیا تھا۔ آنے والے واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ فہیم کو وہ ٹرک اور ان کے اندر جو کچھ لایا گیا تھا، بہت ہیچ سا محسوس ہوا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور رات بھر کا طویل سفر سامنے تھا۔

گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے اس کی نظریں جھگیوں کے جھرمٹ کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے سامنے سے وہی مرد آتا نظر آیا۔ وہ خالی ٹرکوں کے قریب سے لاتعلق سا گزر گیا۔ وہ خیالوں میں گم بے مقصد سا ایک جانب کو جا رہا تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے چپلوں کے نیچے مٹی اور ریت کے اندر کہیں گہرائیوں میں سیاہ سونے کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

(سہ ماہی ''فنون'')

☆☆☆

بنت اللہ بخش سیال

میرے ابیّ ، میرے مربیّ

اللہ بخش سیال مرحوم کا تذکرہ

اللہ بخش سیال مرحوم کا تذکرہ، جو جماعت اسلامی کے ابتدائی ارکان میں سے تھے۔ان کی رکنیت ۱۹۴۶ء میں مولانا مودودیؒ نے منظور فرمائی۔دعوت دین کے راستے میں جدوجہد سے بھرپور صالح زندگی بسر کر کے ۲نومبر۲۰۱۴ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

''آپ اتنے بچوں کے ساتھ جماعت کا کام کیسے کر لیتی ہیں؟'' وسطی پنجاب کے اجتماعِ ناظمات لاہور میں، سوا ماہ کے اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ گئی تو مجھ سے اچانک سٹیج پر بلا کر سوال کیا گیا اور فوری طور پر شاید گھبراہٹ کی بنا پر میں اس کا کوئی جواب نہ دے پائی۔ بعد میں سوچنے پر احساس ہوا کہ اس میں میرا ذاتی کوئی کمال نہیں بلکہ یہ والدین والے گھر کے ماحول، تربیت اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات مجھ پر تھیں کہ اگر میں اس وقت اور ہر حال میں جماعت کا یعنی اقامتِ دین کا کام نہ کرتی تو عنداللہ ماخوذ ہوتی۔

بچپن سے ہی صبح (قبل از فجر) جب بھی آنکھ کھلی تو ابی جان کی نماز تہجد نسبتاً اونچی آواز میں تلاوتِ قرآن سے کھلی۔ میں کہتی کہ ''ابی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' تو کہتے ''کہ اٹھ کر دو نفل پڑھ لو اور جو قرآن یاد کیا ہے اس میں پڑھو۔ ڈر نہیں لگے گا۔'' جلد سونے اور تاکیداً جلد سلانے کی عادت ڈالی اور ہمیشہ اپنے الفاظ میں نہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ میں کہ عربی متن میں اکثر سنائی گئی یہ حدیث نہیٰ رسول اللہ عن النَّوم قَبْلَ الْعِشَاء والحدیث بَعْدَ الْعِشَاء (نبی اکرمؐ نے عشا سے قبل سونے اور عشاء کے بعد باتیں کرنے سے منع کیا ہے) ابھی بھی میرے کانوں میں ابیّ جان کی آواز میں گونج رہی ہے۔

کبھی کبھار جماعتی خصوصی مصروفیات یا شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کی بنا پر رات کو دیر سے لوٹتے تو ٹھنڈے دودھ کے ساتھ ٹھنڈی روٹی خود ہی اٹھا کر کھا لیتے حالانکہ ابیّ جان کو کھانا دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا نہ سالن گرم کرنا ہوتا، نہ تازی روٹی پکانی ہوتی، نہ کوئی اور اہتمام بلکہ حقیقتاً تناول ما حضر کرتے۔ البتہ میٹھا اور خصوصاً کھجوریں شوق سے کھاتے۔

ہمیشہ سادہ کھانا کھاتے۔ غذا میں لذت کی بجائے غذائیت کا خیال رکھتے۔ بازاری کھانا نہ کھایا، نہ کھلایا لیکن موسمی پھل روزانہ لازماً گھر لاتے اور دودھ تاکیداً پلواتے اور بادام کھانے کی تاکید کرتے۔

سنتِ نبویؐ سے والہانہ عقیدت تھی۔ کبھی ہمیں بیٹھ کر تسبیح کرتے دیکھتے تو کہتے نبیؐ نے کبھی بیٹھ کر تسبیح نہیں کی (پڑھی) حضرت جویریہ والی حدیث سناتے اور چلتے پھرتے 'سبحان اللہ عدد خلقہٖ' پڑھنے کی تاکید کرتے۔

میں کپڑے دھو رہی تھی تو بتایا کہ ساتھ ساتھ جو قرآن یاد ہے دہراتی جاؤ اور ایک وقت میں دو نیکیاں کمانے کی عادت ڈالو۔ نوافل کے سجدوں میں مسنون استغفار کے کلمات پڑھ سکتی ہو تو پڑھو۔ دعائے ماثورہ تاکیداً یاد کرواتے طاہر بھائی جان کے انتقال پر ہم ان کی غیر موجودگی میں سورۃ الفاتحہ او رسورۃ اخلاص ان کے ایصال ثواب اور مغفرت کے لئے پڑھتے رہے۔ لاہور سے آنے پر یہ سن کر ناراض ہوئے اور مسنون دعا میت کی بخشش کیلئے یاد کروائی۔ صلاۃ التسبیح پڑھتے دیکھا تو کہا نبیؐ نے خود کبھی نہیں پڑھی قیام میں تسبیح نہیں قرأت قرآن مسنون ہے۔

ہمارے محلے میں رمضان میں جمعہ کے روز صلوٰۃ التسبیح ہوتی تھی ڈیڑھ دو سو خواتین جمع ہوتی تھیں وہاں درس کے لیے استقبال رمضان (خرم مراد) لا کر دیا دوسرے جمعہ جب میں کسی اور موضوع پر درس تیار کر رہی تھی تو سمجھایا کہ یہاں بالکل نئی اور سادہ خواتین آتی ہیں۔ نماز پر درس دو اور خود بتایا کہ ذرا مئوثر انداز میں شروع کرو۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدو......والی حدیث

ابتداء میں رکھو، اور اگلے جمعہ کیلئے حقوق العباد پر درس کا مشورہ دیا۔

درس قرآن تیار کرتے وقت ''معجم المفھر س'' کنسلٹ کرنے کی تاکید کرتے جسے اپنی مخصوص اصطلاح میں حافظ صاحب کہا کرتے۔ میں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں۔ میرا درس قرآن سن کر خوش ہوتے، اصلاح کرتے اور مشورے دیتے۔ مجھے یاد ہے تبلیغی جماعت کی مسز درثمینہ عارف صاحبہ کے گھر مائیک پر درس قرآن تھا، خود لے کر گئے تھے اور باہر موجود تھے میں نے وَاِذا قُرِئَ علیکم القرآن پڑھا تو گھر آ کر تصحیح کروائی کہ صحیح آیت وَاِذِ قُرِئَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوْالَهُ وَاَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْن ہے (یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

ماموں جان محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے کتابچے لا کر دیتے اور پڑھنے کی تاکید کرتے۔ ان کا کتابچہ ''قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں'' جتنا ابیّ جان نے ''خطبات'' کے ہمراہ بانٹا ہے شاید ان کی اپنی تنظیم کے کسی فرد نے نہ بانٹا ہوگا۔ میں کہتی ابیّ جان کیا آپ تنظیم اسلامی کے طریق کار سے متفق ہیں؟ تو بتاتے کہ اقامت دین اور اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کے لزوم پر ہمارا اور ان کا نقطۂ نظر ایک ہے مگر اقامت دین کیلئے اختیار کیے گئے طریق کار پر ہمارا اختلاف ہے۔ میں مولانا مودودیؒ کے بتائے ہوئے طریق کار اور منہاج کو صحیح سمجھتا ہوں اور جماعت اسلامی کے طریق کار پر دل کا اطمینان اور یکسوئی موجود ہے۔ اجتماعیت میں شمولیت اور پھر رکنیت کو ضروری سمجھتے تھے۔ سب بہنوں کی رُکنیت کی درخواستیں دلوائیں۔ وہ کہتیں کہ بچے بہت چھوٹے ہیں ابھی ہم اجتماعات میں شرکت نہیں کر سکتیں تو کہتے کہ اجتماعیت فرض ہے اجتماعات نہیں۔ شرعی عُذر رہے تو اجتماعات میں نہ جاؤ مگر عُذر نہ ہونے کی صورت میں شرکت ضروری ہے۔

1994ء میں شادی کے بعد رخصت ہو کر لاہور آ گئی۔ میں اسلامی جمعیت طالبات کی رکن تھی۔ انہی دنوں غالبًا ابیّ جان کی تجویز پر یہ طے ہوا تھا کہ جمعیت کی سابقہ رکن کو تین یا چھ ماہ تک جماعت اسلامی کا رکن بنا لیا جائے گا۔ میری درخواست رکنیت شادی سے پہلے ہی دلوا چکے تھے۔ ابیّ جان کی کوششوں سے شادی کے تین چار ماہ بعد ہی میری رُکنیت منظور ہوگئی۔ میرے حلقے میں جماعت کے افراد سے میرا تعارف اور رابطہ بھی انہی کے ذریعے ہوا اور دو دعوتی حلقے بھی انہی کی محنت اور توجہ سے شروع ہوئے اور جاری رہے۔

صرف بیٹیوں ہی نہیں دامادوں کو بھی تحریک سے جوڑنے کیلئے کوشاں رہے۔ خطبات، روداد جماعت اسلامی اور دستور مطالعہ کیلئے دیتے اور متعلقہ امیر اور نظم سے ملاقات کر کے رُکنیت کی سفارش کرتے۔ نواسوں، نواسیوں سے رکنیت کی درخواستیں خود دلوائیں۔ الحمدللہ آٹھ داماد اور چھ نواسیاں رُکن جماعت ہیں اور باقی سبھی مختلف اجتماعیّتوں سے اقامت دین کی جدوجہد میں شریک ہیں۔

ابیّ جان کی یادداشت الحمدللہ بہت اچھی تھی۔ دستور کی دفعات خصوصاً شرائط و فرائض رکنیت حرف بحرف یاد تھیں۔ تحریک جماعت اسلامی کا سارا سفر تاریخ بتاریخ یاد تھا۔ کوئی واقعہ سناتے تو سنہ کا ضرور ذکر کرتے کہ کب کا واقعہ ہے۔ میں چوتھی جماعت میں تھی اور مجھ سے ''خطبات'' اونچی آواز میں پڑھوا کر سن رہے تھے اور اُردو الفاظ کی تصحیح بھی کرا رہے تھے۔ میں نے از رہِ شرارت اور جان چھڑانے کیلئے چھوڑ چھوڑ کر پڑھنا شروع کر دیا تو انہیں فوراً پتہ چل گیا کہ میں نے چھوڑ کر پڑھا ہے۔ مجھے احساس دلا کر بس کروا دیا۔

قرآن یاد کروانے کی طرف خصوصی دھیان دیتے خود بھی غالبًا تہائی قرآن کے حافظ تھے۔ یہ حدیث سنا کر کہ ''حافظ قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا اور جنت کے درجے چڑھتا جا'' خصوصی شوق پیدا کرتے۔ سب بچوں کو کم از کم 2 پارے حفظ کروائے۔ مگر ساتھ یہ بھی کہتے کہ اتنا یاد کرو کہ یاد رکھ سکو۔ قرآن یاد کر کے بھلانا بڑا گناہ ہے۔ کوئی بچہ کہتا ''ابیّ کل میری تاریخ پیدائش ہے تو کہتے کہ پھر تو کل صبح زیادہ لمبی تہجد پڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا ہوگا کہ اتنی زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا۔ ایک دفعہ ہم بچوں نے مل کر کہا ''ابیّ نیا سال مبارک ہو، تو کہنے لگے ''مبارک تو تب ہوگا جب قرآن کا کوئی حصہ مزید یاد کرو گے۔

کیا آخری پارہ پکا ہے؟'' ہم نے کہا سورۃ المطففین بھولتی ہے تو کہا کہ اسے پکا کرو۔ پھر ہم سب بچے (پڑھائی کی غرض سے نواسے بھی ان کے پاس رہے تھے) نئے سال کی ابتداء سورۃ المطففین یاد کر کے کر رہے تھے۔

قرآن مجید کے عالم تھے اور ہر خاص و عام کو ترجمہ اور فہم سیکھنے پر آمادہ کرتے۔ ان کے لیے تعزیتی الفاظ کہتے ہوئے اکثریت نے گواہی دی کہ ہم نے قرآن کا ترجمہ ان کی بار بار تاکید اور یاد دہانی سے شروع کیا۔ ہم بہنوں کو کوئی بزرگ عالم دین گھر آ کر ترجمہ قرآن پڑھایا کرتے اور فہم قرآن کیلئے عربی گرائمر بھی سکھاتے۔

آج کل ہم سب عمومی افراد اور خاص طور پر مدرّسین یہ سمجھتے ہیں کہ درس قرآن دے لینا اور مجمع کو شعلہ بیانی سے مسحور کر لینا ہی گویا تبلیغ دین کا اصل میدان ہے۔ لیکن اس معاملے میں کوتاہ نظری سے ہم تبلیغ دین کی اصل بنیاد کو فراموش کر دیتے ہیں۔ دین کی دعوت کو پھیلانا، لوگوں کو دین کی طرف رغبت دلانا، خصوصاً جوانوں کو قرآن کے معانی و مفہوم کی طرف راغب کرنا، کنڈیاں کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر لوگوں کو فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرنا، قلبی تعلق بنا کر لوگوں کو اجتماعیت سے منسلک کرنا انفاق کیلئے لوگوں سے باقاعدہ درخواست کرنا۔ مستقل ربط رکھ کر ''مِس خام کو کندن بنانا'' یہ وہ کام ہیں جن کے کرنے والوں کے نام نا تو زبان زد عام ہوتے ہیں نہ ہی کسی دعوت نامے یا کتابچے کی زینت بنتے ہیں لیکن یہی وہ کردار ہیں جن کی وجہ سے مساجد میں صفوں کی قطار، قرآنی کلاس میں حاضرین کی تعداد، ترجمہ القرآن سیکھنے والے طلباء کی کلاس اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کی تعداد اور اعانت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ابیّ جان بھی ایسا ہی زریں کردار تھے جن کی دعوت سے لوگ نماز ترجمہ قرآن، تفہیم قرآن، عربی گرائمر، بنیادی پمفلٹس سے اجتماعیت کی طرف آئے۔ بقول ڈاکٹر اسرار احمد اگر کسی نے مثالی تحریکی کارکن اور داعی الی اللہ کو دیکھنا ہو تو سیال بھائی کو دیکھ لے۔

نماز باجماعت کا بہت اہتمام کرتے۔ ہمارے درمیان بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے۔ جماعت کا وقت ہو جاتا تو نبیؐ کی طرح اجنبی بن جاتے۔ جماعت کا وقت ہونے پر کوئی لڑکا ان کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ سونے کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ مہمانوں کو بھی لازماً نماز باجماعت میں شریک کرواتے۔ فجر کیلئے جب تک ہمت تھی محلے میں لوگوں کی کنڈیاں ہلا کر نماز کیلئے جگاتے، فون کر کے اپنے بچوں، نواسوں، کزنز کے بچوں کو جگاتے اور نماز باجماعت کی اہمیت یاد دلاتے رہتے۔

جہاد فی سبیل اللہ خصوصاً قتال فی سبیل اللہ کا بہت شوق اور جذبہ تھا۔ 1971ء کی جنگ میں رضا کارانہ شہری دفاع میں حصہ لیا۔ 1995ء میں نواسے کے ہمراہ جہاد کشمیر میں حصہ لینے کیلئے حزب المجاہدین کے تحت ٹریننگ لینے کا ارادہ کیا جو نجانے کس وجہ سے پورا نہ کر سکے۔ بہر حال نواسے کو بھیج دیا لیکن جہاد بالمال ساری عمر کرتے رہے اور اسے انفاق فی سبیل اللہ کا اعلیٰ درجہ اور اللہ کے ذمہ قرض حسنہ سمجھتے رہے اور سمجھاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ (جو ہم از روئے دستور جماعت کو دینے کے پابند ہیں) کے علاوہ ہم اپنے انفاق کا زیادہ حصہ جہاد فنڈ میں دیتے ہیں۔ بیٹوں اور بیٹیوں کی آمدنی میں سے جہاد کیلئے ماہانہ حصہ مقرر کرنے کی تاکید کرتے۔ مرحوم اقرباء کیلئے بہترین ایصال ثواب بھی اسے قرار دے کر جہاد بالمال پر آمادہ کرتے۔ ہمارے اظہار ماموں (مرحوم) بہت کھلے دل کے مالک تھے۔ اللہ کی راہ میں بہت خرچ کرتے تھے۔ انہیں بھی حدیث ''**من جهز غازيا فقد غزىٰ و من خلف غازياً فقد غزىٰ** (جس نے مجاہد کو ساز و سامان مہیا کیا اس نے جہاد کیا جس نے مجاہد کے پیچھے اس کے اہل و عیال کی کفالت کی اس نے جہاد کیا۔'' سنا کر جہاد بالمال پر آمادہ کرتے یہاں تک کہ انہیں کہنا پڑا کہ ''سیال بھائی اب اتنا لالچ بھی نہ دلوائیں''۔

تعزیت کیلئے جاتے تو بھی احادیث سنا کر تسلی دیتے۔ نواسے ڈاکٹر عبدالمحسن کی وفات پر بیٹی کے ہاں گئے تو سر پر ہاتھ رکھ کر ''بیت الحمد'' کی خوشخبری والی حدیث سنائی۔ ایک داماد کے والد کے انتقال پر ان سے اور ان کے گھر، تمام بھائیوں سے تعزیت کرتے ہوئے انہیں حدیث سنائی کہ جب ابن آدم کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس

کے عمل کا دفتر بند ہو جاتا ہے مگر تین ذرائع ہیں 1۔علم نافع جس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو۔ 2۔نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔ 3۔صدقہ جاری۔اور رہنمائی دی کہ تم ان کے لیے دعائے مغفرت کے تحفے بھیج کر اوران کے رشتہ داروں سے حسن سلوک کر کے ان کی وفات کے بعد بھی ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کر سکتے ہو۔

الحمدللہ دنیاوی زندگی بہت اچھی گزری لیکن دنیا کی محبت کو کبھی دل میں نہ آنے دیا نہ دنیاوی ساز وسامان اکٹھا کیا۔ کمر درد کی وجہ سے تخت پر سوتے،اسی پر کھانا کھاتے۔اسی پر سنت ونوافل ادا کرتے۔وارڈ روب کا کام ایک لوہے کا ٹرنک دیتا۔البتہ کتابوں سے بیٹھک کی تین دیوار گیر الماریاں بھری ہوئی تھیں جن میں تفہیم القرآن کے سیٹ ترجمہ قرآن (مودودیؒ) تفاسیر قرآن اور عربی متن کی احادیث کی کتب جماعت کا ابتدائی اور تقریباً سارا لٹریچر موجود تھا۔ مجھے اسلامیات میں ماسٹرز کے لے چند ہی کتب خریدنا پڑیں باقی سب وہیں سے مل گئیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب کے گھروں میں بھی ان کی ترغیب سے اسلامی کتب کی لائبریریاں موجود ہیں جن میں کافی کتب ان ہی کی ہدیہ کی ہوئی ہیں۔

نیکیوں میں مسابقت کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔قیام اللیل،انفاق فی سبیل اللہ،دعوت الی الخیر (خیر عظیم قرآن مجید) امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور صلہ رحمی میں اپنے ہم عصروں سے آگے رہنے کی کوشش کرتے۔

لاہور کے عبداللطیف صاحب کی چار بیٹیاں اسلامی جمعیت طالبات کی رکن تھیں اور ہم تین بہنیں جمعیت کی رکن تھیں۔ (چوتھی امیدوار رکن) تو کہتے کہ وہ ہم سے آگے نکل گئے۔لیکن شاید کسی کی نو بیٹیاں ارکان جماعت نہ ہوں۔ ان شاء اللہ اس اعزاز میں وہ دنیا و آخرت میں منفرد اور آگے ہوں گے اور نبیؐ ان کے ذریعے دو سو دس امتیوں (ان کی حیات میں اولاد) کے اضافہ سے اپنی امت کی کثرت پر فخر کریں گے اللہ کرے یہ اولاد ان کے لیے صدقۂ جاریہ بھی ثابت ہو آمین۔

بہت صابر انسان تھے۔تکلیف اور درد کا کبھی ذکر نہ کرتے تھے۔ نہ کبھی دنیاوی تکالیف اور پریشانیوں پر انھیں روتے دیکھا۔لیکن سحر کے اوقات میں گڑگڑا کر استغفار کرتے۔سجدے میں ہوتے اور ہچکیوں سے رونے کی آواز آتی۔کبھی روتے ہوئے یہ نظم پڑھتے۔''الٰہی تو ستار غفار ہے،میرا نام عاصی گنہگار ہے''۔

میرے کانوں میں ان کی آواز ابھی بھی گونج رہی ہے جو قیام اللیل میں سورۃ الحاقہ کی آیات **خذوہ فغلوہ . ثم الجحیم صلوٰۃ** پڑھتے وقت تھی۔شدت گریہ سے الفاظ رک رک کر نکل رہے تھے اور ہر آیت کے بعد **ربنا لا تجعلنا منھم** ہے تھے۔وفات سے چند ماہ قبل سجدے میں گڑگڑا کر رو رہے تھے۔بہن نے پوچھا ابی جان آپ کو کہیں تکلیف تو نہیں کیوں رو رہے ہیں؟ تو بتایا کہ قرآن بھولتا جا رہا ہوں اس کا بہت دکھ ہے۔

حب الٰہی ان میں بہت زیادہ تھی اور اللہ تعالیٰ بھی یقیناً ان سے محبت کرتے ہوں گے جو ان کی باتوں کی لاج رکھتے تھے۔اپنے ایک نواسے کی شادی اپنی نواسی سے کرنا چاہ رہے تھے۔بعض وجوہات کی بنا پر اس کا دور دور تک امکان نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس شادی کی تاریخ جب اچانک طے ہوئی تو وہ حدیث فوراً ذہن میں آ گئی جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اللہ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے حلیے کی وجہ سے تم انھیں کم مرتبہ سمجھو لیکن جب اللہ کا نام لے کر وہ کوئی قسم کھا بیٹھتے ہیں تو اللہ ضرور ان کی قسم پوری کرتا ہے۔ایسے ہی امی جان بتاتی ہیں کہ ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء میں ابی جان کہنے لگے کہ ہم ان شاءاللہ اس سال حج کریں گے بات مضحکہ خیز لگی کہ ہم مقروض ہیں۔کیسے قرض ادا ہوگا؟ اور کیسے حج کا زادِ راہ اکٹھا ہوگا۔لیکن ابی جان نے کسی کاروبار میں شراکت کی تھی اس کے منافع کا واحد مصرف ان کی نظر میں یہ تھا کہ والدہ اور اہلیہ سمیت حج کر لیں اور اللہ نے ان کی بات پوری کر دی۔

خواتین اپنے بچوں کے لیے دم کروانے آتیں تو دم کر دیتے مگر جب ہم دم کرنے کا کہتے تو کہتے کہ خود ہی آیت الکرسی، درود شریف اور چاروں قل پڑھ کر دم کر لو۔صرف زوجین میں ناچاقی ہوتی تو تہجد کے وقت دعا کر کے چینی پر دم کر دیتے اور اللہ تعالیٰ اس میں اثر ڈال دیتے

تھے۔ باذن اللہ۔ کبھی پوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ کیا پڑھتے ہیں۔ وفات سے تین ماہ پہلے ایک دن ہم نے ہمت کر کے پوچھا تو بتایا کہ حمد وثنا اور درود شریف کے بعد دعا پڑھتا ہوں۔ **اللھم الف بین قلوبھما** (میاں بیوی زوجین کا نام لے کر) **کما الفت بین محمدؐ و بین خدیجہؓ** اسی طرح بین محمدؐ وبین عائشہؓ اور ام سلمیٰؓ، حفصہؓ وغیرہ پڑھتا ہوں۔

ابی جان اجتماعات میں اہل خانہ کو بھی شریک کرواتے خاص طور پر جماعت کے اجتماع عام میں اہل خانہ کے ہمراہ شریک ہوتے۔

۱۹۶۳ء کے اجتماع عام میں جب جماعت کے کارکن اللہ بخش شہید ہوئے تو امی جان و دیگر اہل خانہ سمجھے کہ ابی جان شہید ہو گئے ہیں نام کی مماثلت کی وجہ سے۔

حب الٰہی میں قرآن اور حب رسول میں حدیث کو راستہ بنانے والے ہمارے ابی جان نے جب شادی جیسے دنیاوی معاملے کو قرآن و حدیث کی کسوٹی 'جب نکاح کرو تو دین کو ترجیح دو' پر پرکھ کر فیصلہ کیا تو رب تعالیٰ نے اس فیصلے پر اپنی پسندیدگی کی سندیوں ثبت کی کہ کنواری بہنوں کی شادی کا معاملہ ہو یا گیارہ لڑکیوں کی تربیت ورخصتی۔ بیٹوں کی تربیت ہو یا دنیوی تعلیم ہو یا اولاد کے معاملات، گھر کا دینی ماحول ہو یا اسلامی طرزِ زندگی کا احیاء، سادگی ہو یا ترجیحات کا تعین، اخلاق وکردار ہو یا جہاد بالنفس و بالمال ہر معاملے میں امی جان، ابی جان کی دست راست بن گئیں اور اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا۔

من عمل صالحا من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینھم حیوۃ طیبۃ

جو مرد وعورت بھی نیک کام کریں گے جبکہ وہ مومن ہوں ہم انھیں پاکیزہ زندگی بسر کروائیں گے۔

امی جان نے ابی جان کو اہل خانہ کی تربیت سے تقریباً بے فکر کر دیا۔ گھر، گھریلو معاملات اور بچوں کی تربیت میں ابی جان کی خواہش کو تقریباً نافذ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت میں بھی اکٹھا کر دے۔

آمین یارب العالمین۔ ان کی وفات پر یہ آیت بے اختیار سب کی زبان پر آئی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَاتَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَاتَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

☆......☆......☆

انشائیہ

شمیم فاطمہ

غموں کے خمیر سے

یوں تو غموں کی تعداد کو شمار نہیں کیا جا سکتا کہ ''فصل غم کا گوشوارہ اور ہے''، مگر وہ غم جو بنیادی اور عالمی غم ہے جس میں ''ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے'' سب ہی مبتلا ہیں، وہ غم ہے ''روٹی، کپڑا اور مکان کا غم!''

اسی غم میں مبتلا ہو کر لوگ اپنا گھر بار، اپنا شہر و دیار، اپنے بچپن کے ساتھی، عزیز رشتہ دار سب چھوڑ چھاڑ پرائے دیس میں جا بستے ہیں کہ اس روٹی، کپڑے، مکان کے غم سے نکل جائیں (بھلے غریب الوطنی کے غم میں ہی مبتلا ہو جائیں)۔ اسی غم میں مبتلا ہو کر لوگ پہاڑوں پر نشیمن بنا لیتے ہیں، گاؤں سے شہر کا رخ کر لیتے ہیں۔ اسی روٹی، کپڑے، مکان کے جھانسے میں آ کر کتنی ہی جبینوں، چاند چہروں نے دھوکے کھائے اور غم اٹھائے ہیں۔ اسی نعرے کا جھانسا دے کر سیاست دانوں نے عوام کو بے وقوف بنایا ہے...... اسی نعرے کو بنیاد بنا کر ماؤں نے بیٹیاں رخصت کی ہیں کہ ہنسی خوشی کر دو وداع، تمھاری بیٹی راج کرے گی! اسی نعرے کا واسطہ دے کر بیٹیوں کو تیار کیا گیا ہے کہ ''سر پر چھت تو ہوگی، دال روٹی تو کھانے کو دے گا...... موٹا مہین کچھ تو پہنائے گا...... محنت مزدوری کرتا ہے نشہ تو نہیں کرتا......''

اسی نعرے پر نوجوان اپنا سفر آغاز کرتے ہیں۔ پھر ساری عمر دوڑتے ہی رہتے ہیں، ساری عمر سفر میں ہی رہتے ہیں۔

اسی نعرے کے تعاقب میں لوگ تن، من، دھن سے لے کر ایمان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اسی نعرے کے فریب میں آ کر کوئی کسی کو بھلا دیتا ہے، کوئی کسی کو اڑا دیتا ہے، کوئی کسی کو پھنسا دیتا ہے۔ کوئی کسی کے مال و املاک پر قابض ہو جاتا ہے۔ بس یہ ایک ایسا رقص بلاخیز ہے کہ جس پر تا تھیا تا تھیا ہو رہی ہے سو ہو رہی ہے...... جیسے جیسے تال بڑھتی ہے، خواہشوں کا شعلہ جوں جوں بھڑکتا ہے اس رقص میں شدت آتی جاتی ہے آخر میں یا تو گھنگھرو ٹوٹ جاتے ہیں یا...... پھر رقاص خود ہی تڑا تڑ...... ڈیش ڈیش...... (کسی سریعنی زہریلے سر کا شکار ہو جاتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ ویسے تو ہمیں بے لباس پیدا کرتا ہے اور اٹھائے گا بھی تو بے لباس ہی لیکن اس دارِ امتحان میں بے لباسی کو اس نے سخت ناپسند کیا ہے اور لنگوٹ سے لے کر کفن تک کے سفر میں لباس کو لازمی قرار دیا ہے۔

اب اس کے لیے انسان جس کو چاہے جتا تا رہے کہ ہم سب خرید سکتے ہیں۔ ساٹھ لاکھ کی گھڑی، پچاس ہزار کے جوتے! خاک ہونا نصیب آدم ہے۔ دنیا اس سے لاکھ مرعوب ہوتی رہے۔ خاک کے پردے سے آدمِ خاکی کو نکالنے والا تو بس لباس تقویٰ ہی کو پسند فرماتا ہے۔ جو یہ لباس زیب تن کر لے اس کی نظروں میں معزز بن جاتا ہے۔ ورنہ کسی برانڈ کی پی لے...... کسی برانڈ کا پہن لے...... اس سے ''اس کو'' کیا!!...... وہ تو اس فرش زمین پر کپاس اگا دیتا ہے کہ کپاس سے دھاگہ تیار کرلو...... دھاگے سے کپڑا بنو، کپڑے سے لباس تیار کرو اور لباس سے تن داغ داغ چھپاؤ۔ اور اس لباس سے اس خاک کے پتلے کو زینت بخشو!

ہم پہلے حکم کو نظر انداز کر کے دوسرے میں جت گئے۔ دھاگہ تیار کرنے کے کارخانے بنائے، ٹیکسٹائل ملیں بنائیں، روزگار کے ذرائع نکالے، ٹیکسٹائل مل سے نکال کے کپڑا بازاروں میں ڈالا، وہاں خرید و فروخت کی، منافع کمایا۔ وہاں سے فیشن انڈسٹری کا قیام عمل میں آیا۔ لباس سازی شروع ہوئی، اس صنعت کو اتنا بڑھایا اتنا پھیلایا اتنا چمکایا کہ نگاہیں خیرہ اور دل تیرہ ہو گئے۔ بس گھوم پھر کے دل لباس اور خوش لباسی میں اٹکا رہے۔ بس گھوم پھر کے نگاہ لباس اور صاحب لباس پر ٹک

جائے۔ پھر کچھ نہ بھائے، دل کو کچھ نہ لبھائے (پہلے آرزو...... پھر خواہش!......پھر ضد......پھر ہر قیمت پر......بس کسی بھی قیمت پر!!)

ہر معاملے میں حد سے گزر جانا ہم نے اپنی عادت ہی بنالی ہے......اور حد سے گزرنے والوں کو وہ پسند نہیں کرتا......ہم ہر معاملے میں اس ناپائیدار دنیا ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

بس دو ہی چیزوں کو مقدم رکھتے ہیں ایک ''من'' کو دوسرا ''جگ'' کو...... جگ سراہتا ہے، ہم پھولتے ہیں......من مانگتا ہے...... مانگے جاتا ہے......ہم دیے جاتے ہیں......نہ ہوس مٹتی ہے نہ بھوک!! (یہ پیٹ تو قبر کی مٹی سے ہی بھرے گا) یہاں عشائیے......عصرانے......انواع و اقسام کے جام......وہاں بھوک اور افلاس کے رقص جنوں خیز میں گھنگھرو کی طرح ٹوٹتے ماؤں کے جگر گوشے!!

زندگی کے مدار میں روٹی، کپڑا اور مکان کا غم ایک تسلسل سے چکر لگاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہماری ذات ایک ذرہ بے نشاں بن جاتی ہے......اس غم سے کلی طور پر رہائی تو ناممکن ہے کہ یہ زندگی کی بنیادی ضروریات ہیں۔ان کے حصول کے لیے جدوجہد بھی کرنی چاہیے۔لیکن اسی کے آگے گھٹنے ٹیک دینا، اپنے گھر سجاتے رہنا......ابدی گھر کو بھولے رہنا......اپنے اطراف پہ نگاہ نہ ڈالنا جہاں غموں کے خودرو پودے بڑی بڑی جھاڑیوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں...... جہاں آنسوؤں میں پورا وجود ڈوبا ہوا ہے...... جہاں یہ غم حوصلہ، ہمت، مسکراہٹ، نیند، چین سب اڑا لے گیا ہے۔

لیکن غم جس شدت اور قوت سے آپ کو پیچھے دھکیلتا ہے آپ اسی قوت اور شدت سے غم کو پیچھے دھکیل دیجیے......کہ نیوٹن کہتا ہے عمل اور ردعمل باہم برابر ہوتے ہیں، اور روبینہ فرید کہتی ہیں سنا ہے غم میں طاقت ہے! اور یہ محض سنی سنائی بات نہیں ہے۔غم میں حقیقتاً طاقت ہوتی ہے۔غم ملنے پر ملول نہ ہوا کیجیے۔ جو غم تحریر شدہ ہیں، طے شدہ ہیں وہ تو ملنے ہی ہیں۔ایسے میں اللہ سے مدد اور رحمت طلب کیجیے۔اپنے آپ کو غم کے ہاتھوں میں نہ دے دیجیے۔آپ اپنے کام کو جاری رکھیے......غم کو حاوی نہ آنے دیجیے۔اس کی موجودگی کو نظر انداز کر کے اپنے وجود کو نمایاں کیجیے ......کوئی منفی رویہ......کوئی انتقام کی راہ......خود کو نقصان پہنچانے کا ارادہ ......دوسروں کو تباہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیجیے۔جس طرح خام مال سے کارآمد اشیاء بنائی جاتی ہیں اسی طرح اس غم کو اپنی قوت بنا لیجیے اور اس قوت کو اس جگہ لگائیے کہ کسی کو شبہ بھی نہ گزرے کہ یہ راحتیں آپ نے غموں سے کشید کی ہیں۔

غم زندگی میں اتنے ہی ضروری ہوتے ہیں جتنا کھانے میں نمک ضروری ہوتا ہے......آپ کی ساری محنت، مشقت، وقت اور لگن بس ایک چٹکی نمک کے بغیر ضائع ہو کر رہ جاتی ہے۔غموں کے بغیر زندگی اپنے حقیقی ذائقے سے محروم رہتی ہے۔حصولِ غم کے بعد ہی ہمارا زاویۂ نگاہ درست ہوتا ہے۔دھند چھٹتی ہے اور منظر واضح ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

میری لائبریری سے

کتاب کا نام: ننھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
مصنف: احسان بی۔اے
پبلشرز: نگارشات پبلشرز 24 مزنگ روڈ لاہور

قارئین:۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ...... جس طرح سے قرآن ایک معجزہ ہے اور اس کے عجائب کا سلسلہ تا قیامت ختم نہیں ہو سکتا۔ حیاۃ طیبہ اسی طرح ایک معجزہ ہے۔ اس لیے انبیاء کو عطا کردہ معجزات کے مقابلہ میں جب بھی قریش مکہ نے آپؐ سے نبوت کی دلیل میں کوئی معجزہ طلب کیا تو اللہ نے قرآن کے ساتھ آپؐ کی زندگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ ہر صفت سے متصف، پاکباز، بے داغ، انسانی وصف کی کوئی بھی مثال ہے تو وہ آپؐ کی حیاۃ طیبہ میں موجود ہے...... زندگیاں تو تمام انبیاء کی ہی کی پاکیزہ تھیں لیکن آپؐ کی حیاۃ طیبہ معجزہ ہے تو اس سے بھی بڑا معجزہ اس کا ایک ایک پہلو ایک ایک لمحہ ہمارے سامنے ایک visual کی مانند موجود ہے۔ ذرائع ابلاغ کی وہ اقسام جو دنیا کو آج عالمی گاؤں بنا کر آپؐ کی پیش گوئی کو پورا کر چکی ہیں اس زمانے میں موجود نہیں تھی پھر بھی بغیر کسی اختلاف کے آپ کی زندگی کا ہر گوشہ ہر پہلو ہمارے سامنے موجود ہے۔ عرب شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

من نحن قبلک الا نقطہ غرقت
فی الیم ادمعتہ خرساء فی القدم

آپؐ سے پہلے ہم کیا تھے؟ کچھ بھی تو نہیں بس ایک نقطہ جو سمندر میں غرق تھا یا بے آواز آنسو جو زمانے میں گم تھا۔

روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوقات آپؐ کی تعریف کرتی ہیں کہ آپؐ سے زیادہ تعریف کی مستحق بس خدا کی ذات ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپؐ کے بارے میں ارشاد بھی کیا اچھا ہے کہ خدا تو ہمیشہ سے موجود تھا محمدؐ نے اس پاک ذات کا تعارف ہم تک پہنچایا۔

قارئین! آپ کو آج کی کتاب تک پہنچنے کا کیا قصہ سنائیں کہ پچھلے سال ربیع الاوّل میں ورجل جورجیو کی کتاب کے تبصرے پر پسندیدگی کے بعد پکا ارادہ باندھ لیا تھا کہ اگلی بار انشاء اللہ سیرت کے بارے میں وہ کتاب پیش کی جائے گی جو اپنے طور پر معلوماتی، دلچسپ اور موثر ہو میرے نزدیک کسی کتاب یا تحریر کے اچھا ہونے کی پہلی (اور آخری) دلیل یہی ہے کہ اسے مکمل کرنے کے بعد دنوں اسی کے حلقہ اثر میں رہیں۔ گفتگو کا موضوع وہی کتاب ہو...... حوالے اسی کتاب کے ہوں...... تو پیارے قارئین خطبات بہاولپور، ایسی ہی کتب میں سے ایک تھی...... لیکن کسی کتاب کی تعریف کی جائے تو پڑھنے والے بجا طور پر اسے مانگنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ سو وہ کتاب میری لائبریری سے مانگنے والے ہاتھوں میں گئی اور اب تک واپس نہیں ملتی، پھر میں نے سیرت کی بہت سی کتب خریدیں کچھ لائبریری سے نکالیں مگر اس کے باوجود کہ سیرت کی ہر کتاب میں ایک نہ ایک پہلو ایسا ضرور موجود ہوتا ہے جس سے ہم پہلے لاعلم ہوتے ہیں پھر بھی کالم کے لئے منتخب کرنے کیلئے اس کی زبان انداز ہر چیز مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ محاضرات سیرت بلاشبہ اچھی کتاب ہے بہت مفید، معلوماتی لیکن اس میں عام فہم لوگوں کے لئے سامان دلچسپی کم ہو سکتا ہے سو تبصرہ شروع کر کے ایک طرف رکھ دی پھر ڈاکٹر عائض القرنی کی سیرت پر محمدؐ نکالی اشعار کو موتیوں کی طرح پرو کر تحریر کی گئی کتاب بھی ترجمے کا صحیح حق ادا نہ ہو سکنے کی بناء پر ایک طرف رکھ دی گئی۔ اس کے بعد کیرن آرمسٹرانگ کی لکھی سوانح حیات ''محمد رسولؐ اللہ'' کا دیباچہ دل و دماغ میں نقش ہونے کے باوجود مصنفہ کی جہاد کے بارے میں تشکیک اور تجلیات نبوت ہر لحاظ سے عمدگی کے باوجود محض

آیات اور احادیث کے تناظر میں لکھے جانے کی بناء پر منتخب نہ کر سکی...... کالم کے آغاز میں لکھی تحریر رد کرنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ننھے حضورؐ تک پہنچتے پہنچتے بلا مبالغہ سیرت کی جس نے نو کتب کھنگالی ہیں۔ ننھے حضورؐ کے انتخاب کے لئے یہی فقرہ کافی ہے جو فاضل مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے میں نے محمدؐ کے بچپن کو ہر رنگ میں ہر انداز میں دیکھا ہے اس کے ہر پہلو سے شدید جذباتی محبت کی ہے اور یہی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔

سیرت کی اس کتاب کو ناول تو نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ اس کے انداز اور تکنیک میں لکھی گئی ہے۔

ننھے حضورؐ کا آغاز اس فقرہ سے ہوتا ہے۔

سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا اور مکے کے اونچے نیچے مکانوں کی دیواریں اور چھتیں کوہ ابوقبیس کے سائے میں سمٹتی جا رہی تھیں۔ مقدس کعبہ سے کچھ دور مشرق کی طرف بازار سے دور ذرا ہٹ کے مکہ کے عظیم قبیلہ قریش کے معزز و مکرم اور محترم سردار عبدالمطلب کے سہ منزلہ مکان کی چھت پر سے دھوپ ابھی ابھی ہٹی تھی اور چھت پر بچھے ہوئے پتھر ابھی تک گرم تھے جیسے انہیں دہکتے تنور میں سے نکالا گیا ہے لیکن یہ تپش سردار عبدالمطلب کی چہیتی بہو آمنہ بنت وہب کو چھت پر آنے سے نہ روک سکی تھی آمنہ بنت وہب پاؤں میں اونٹ کے بالوں کی نرم اور موٹی جوتی پہنے چھت پر آ گئی تھی اور منڈیر کے قریب کھڑی دور شام سے آنے والی سڑک کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں......

قارئین نئی نویلی دلہن آمنہ بنت وہب کتاب کا سب سے مضبوط کردار ہے۔ ان کے جذبات، احساسات، امنگیں، آرزوئیں سب کی داستان بہت ادبی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

سردار عبدالمطلب کا کردار کی ایک جھلک......سردار عبدالمطلب کمرے میں بچھے ہوئے کمبلوں پر آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے وہ اس دنیا میں سو کے قریب برساتیں گزار چکے تھے اس طویل عرصے میں انہوں نے مکے کی سیاست کو ایک نہیں کئی بار پلٹتے دیکھا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے سیدھا کیا تھا انہیں وہ خواب آج بھی یاد تھا جس میں انہیں چاہ زمزم کی نشاندہی کی گئی تھی اور حکم دیا گیا تھا کہ اسے کھودو اور اپنے خاندان کے ساتھ اہل مکہ کو بھی سیراب کرو۔ اس کنوئیں کے حقوق ملکیت کے لئے قریش کے گھروں میں انتشار پیدا ہونے لگا تھا اور اسی وقت عبدالمطلب کو یہ احساس ہوا کہ ان کی اپنی اولاد ہونی چاہیے کثیر اور مضبوط...... انہوں نے لات وعزیٰ کے سامنے منت مانگی تھی کہ اگر انہیں دس لڑکے عطا ہوں تو وہ ان میں سے ایک کو دیوتاؤں کے راستے میں قربان کر دیں گے پھر انہوں نے اس آرزو کو پورا ہوتے دیکھا وہ دس بیٹیوں کے باپ اور قریش کے طاقتور سردار بن گئے......

پوری کتاب میں عربوں کا کلچر، روایات، طور طریقے اور کرداروں کو اس جاندار طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ ہر کردار اپنے اردگرد چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ لونڈیوں اور غلاموں کے ملک میں آمنہ بنت وہب کی لونڈی برکہ......مالکن کی وفادار کے روپ میں الگ نظر آتی ہے۔

اور گھر میں جیسے بارات آ گئی......بکری ذبح کی گئی تاکہ یخنی بنائی جانے پر پھر عبداللہ کے ساتھ کوئی مہمان بھی تو آ سکتا ہے...... بنی ہاشم کے گھر میں کوئی مہمان آئے اور آؤ بھگت نہ ہو؟......اس لئے پوری بکری پکائی جائے گی۔ برکہ کے احتجاج کے باوجود مالکن حضور خود سارا کام کرنے پر مصر تھیں کہ کم از کم چھوٹے سردار کا کھانا وہ خود بنائیں گی...... انہیں ان کے ذائقے کا علم تھا اگر شوربے میں ذرا سی بھول چوک ہو جائے تو وہ ثرید کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے انہوں نے آمنہ کے ہاتھ کے ثرید کو ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ تعریف کی تھی۔

قارئین......کہانی لکھتے ہوئے اردگرد کے ماحول کی منظرکشی کرنا ہر قلمکار کے بس کی بات نہیں......خاموش چاندنی مکے کی پرسکون فضاؤں پر ایک روپہلی چادر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ ایک عجیب خاموشی، ناقابل فہم سناٹا چاروں طرف مسلط تھا اور دھندلی روشنی میں مکے کا چوک صاف دکھائی نہیں دیتا تھا......اور......

چاند دور افق میں لٹک رہا تھا تارے جھلملا رہے تھے اور ان ملگجی اندھیاروں میں شمعیں دھکڑ دھکڑ جل رہی تھیں وہی تاریکی اور روشنی کی آنکھ مچولی اور اس آنکھ مچولی میں پھرپھراتی ہوئی عبائیں یثرب سے

آنے والا قافلہ ایک بیوی کو بیوہ بننے کی خبر دیتا ہے۔

دروازہ اتنی تیزی سے کھلا جیسے یہ خود کھل جانے کے لیے بے چین تھا۔ آمنہ کی نگاہوں نے بیک نظر دیکھ لیا سردار عبدالمطلب ہیں ساتھ حارث بھی ہیں اور......اور......عبداللہ کہاں ہیں؟ ان کے ہونٹوں نے چیخ کر کہا۔

سردار عبدالمطلب کی آواز کنوئیں میں سے سنائی دی۔

......روؤ...... روؤ آمنہ...... اپنے بال نوچ لو......تم بیوہ ہو گئی ہو......

آسمان کے اونگھتے ہوئے بڑھے ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے...... قارئین بیوگی کی ان سطور میں پڑھنے والے کو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔لیکن فن کی معراج ننھے حضور کی آمد ہے۔

کتاب کا حسن چھوٹے چھوٹے مکالمے ہیں......ذرا ملاحظہ کیجئے ورقہ ابن نوفل اور سردار عبدالمطلب کا مکالمہ گھر سے آرہے ہو ورقہ۔

جی ہاں چچا سردار۔

آمنہ کا کیا حال ہے؟

بھابھی کا......؟ کیوں......؟ وہ کل تک تو ٹھیک تھیں۔

ماں آدھی رات کے قریب انہیں یکا یک تکلیف ہو گئی تھی ابن نوفل، کعبے کے دیوتا ہمیں عبداللہ کی نشانی سے نوازنا چاہتے ہیں۔

آپ تو بہت پریشان ہیں سردار!

آمنہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ابن نوفل...... میں ان پتھروں کو جھنجوڑنا چاہتا ہوں۔

اگر انہیں زندگی کی ہی ضرورت ہے تو میری جان حاضر ہے لیکن میرے عبداللہ......

آقا سردار......آقا سردار......دور سے کسی نے پکارا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا برکہ ہرن کی سی تیزی سے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے بتوں میں بھاگتی چلی آرہی ہے سردار قریش لپک کر ان کے پاس پہنچ گئے۔

گھر چلئے آقا سردار......جلدی گھر چلیے ...... ننھے حضور تشریف لائے ہیں......قارئین کامیاب حکیم نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض پہچانتا ہے کامیاب مصنف قاری کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے...... ننھے حضور کی آمد پر تحریر ایسی قلقاریاں مارتی محسوس ہوتی ہے کہ ہونٹ مسکرا اٹھتے ہیں۔

ایک ننھی آواز فضا کو چیرتی ہوئی آرہی تھی یہ آواز ننھے حضور کے رونے کی تھی ایک بچے کے رونے کی......لیکن اس آواز میں عجیب سا جادو تھا عجیب کیف......جیسے فضا میں پروں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں سمو دی گئی ہوں۔ انہوں نے فضا میں اِدھر اُدھر دیکھا کوئی چیز دکھائی نہ دی کوئی خاص تبدیلی نہ تھی کہیں انوکھا پن نہ تھا لیکن فضا میں نغمے تیر رہے تھے جیسے خود ہوائیں گا رہی تھیں جیسے مکان کا ایک ایک ذرہ ہوا کی ایک ایک لہر خوشی کے ترانے گا رہی ہو......عرش سے فرش تک پوری کائنات نغمہ و نور کے بے کراں سمندر میں بدل گئی......!!

قارئین! دنیا میں شاید کسی بچے کی پیدائش کا اتنا تذکرہ کیا گیا ہو اور اس والہانہ انداز سے......ذرا دیکھئے۔

برکہ نے کمبل ایک طرف ہٹا دیا آمنہ ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں ان کے جسم پر تین چار کمبل پڑے ہوئے تھے سردار قریش کی نگاہیں آمنہ سے فوراً ہٹ کر ان کے پاس سے ہٹ کر ان کے پاس چادر میں لپٹے ہوئے گوشت کے ایک ننھے سے لوتھڑے پر مرکوز ہو گئیں جس کا چہرہ باریک اوڑھنی سے ڈھانپ دیا گیا تھا اس باریک اوڑھنی میں سے رونے کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

برکہ نے اوڑھنی ہٹا دی اور خوشی کی کسی اثیری بلندی پر سے پکار کر کہا۔

''ننھے حضورؐ......''

سردار قریش نے دیکھا ننھی ننھی سرخ مٹھیاں فضا سے لڑ رہی تھیں ننھی آنکھیں بند تھیں اور چھوٹا سا سرخ دہانہ زندگی کے فوارے اچھال رہا تھا......چھوٹی سی ناک، اونچی پیشانی، گیلے گیلے ریشم جیسے بال، ناک کے اوپر ملی ہوئی بھنوؤں کی تیلی سی لکیر اور چھوٹی چھوٹی سرخ رگوں کا جال جو زرد زرد کھڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے رونگٹوں کی تہہ میں بنا ہوا تھا......

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے جھک کر ننھے حضور کو اٹھا لیا سردار عبدالمطلب کے ہونٹ جھکے اور بلند پیشانی سے پیوست ہو گئے۔

اف معبود!

یہ کیسا سرور تھا...... عبدالمطلب کو محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے آمنہ کے لال کے ماتھے پر نہیں مقدس کعبہ کے سنگ اسود پر ہونٹ رکھ دیئے ہوں۔

قارئین لفاظی سننا اور پڑھنا کم از کم میرے لئے کبھی آسان کام نہیں رہا لیکن اس کتاب میں لفاظی ہی کتاب کی روح ہے......!

ننھے حضور کی رسم عقیقہ ہو یا ننھے حضورؐ کے نام کے انتخاب کا مرحلہ پڑھ کر وجد آ جاتا ہے۔

رسم عقیقہ میں ننھے حضور کی آمد نے مہمانوں میں تحرک سا پیدا کر دیا گویا باد بہاراں کا جھونکا آیا جس سے پورا گلشن جھوم اٹھا سارے مہمان برکہ کے گرد جمع ہو گئے دشمن دشمنوں کے شانے سے شانہ بھڑائے کھڑے تھے اور نظریں اپنی ساری کدورتیں بھول کر ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں ابن عبداللہ کی چمکدار سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت دہانہ اور حسین مخروطی ٹھوڑی ان نظروں کو گلے ملا رہی تھی۔

قارئین آگے چلتے ہیں...... آج جبکہ برکہ کے ننھے حضورؐ نے 21 دن پورے کر لئے برکہ نے سورج کی آنکھ کھلنے سے بہت پہلے زم زم کا پانی گرم کر کے ننھے حضورؐ کو نہلا دیا......

عام عورتیں تو سرعام چشموں اور تالابوں میں اتر جانے میں عار محسوس نہ کرتیں بلکہ اپنی برہنگیوں کو عام مردوں کے سامنے اچھال دیتیں اس امید پر کہ شاید کسی شاعر کی نظر پڑ جائے اور اس کا حسن شعر بن کر سارے عرب میں گونجنے لگے ان سب کے برعکس آمنہ بنت وھب کے انداز نرالے تھے خود برکہ شب و روز خدمت میں مصروف رہنے کے باوجود آج تک مالکن کے ٹخنوں سے اوپر نہ دیکھ سکی تھی......!

قارئین ان مراحل سے گزرنے کے بعد قبیلہ بنی سعد کی عورتوں کی آمد بچوں کو لے جانے کی اور ننھے حضور کو منتخب کرنے کی وجہ پھر قافلے کی روانگی طویل باب پر مشتمل ہے...... جب حلیمہ سعدیہ آمنہ کے ہاں پہنچتی ہیں۔

''میرا نام حلیمہ سعدیہ ہے میں بنو سعد سے ہوں میرے میخوں کے پردے بادیہ بنو سعد کی ہواؤں میں رقص کرتے ہیں ہمارا قبیلہ کبھی حجاز کی سرحدوں کو عبور کر کے باہر نہیں گیا...... قریش کی معزز بیگم یقین فرما لیں کہ ہماری زبان پر گونگوں کا اثر نہیں ہوا نہ ہی ہماری ہواؤں پر شہری گندگی اور غلاظت کا اثر ہے بادسمولہ اپنی گرم لپٹوں سے ہمارے میخوں کو دھوتی صاف کرتی اور نکھارتی ہے۔ بچوں کے ساتھ ہماری محبت قریش بھر میں مصروف ہے ہم بنو سعد والی جانتی ہیں کہ روتے بچوں کو کیسے ہنسایا جاتا ہے اور کمزور جسم والوں کو کن ترکیبوں سے توانا اور مضبوط کیا جاتا ہے۔

قارئین یہ فصاحت و بلاغت، عربوں میں بنو سعد کا خاصہ تھی۔ طویل مراحل سے گزر کر وہ ننھے حضور کو دیکھنا چاہتی ہے کہ معاوضہ طے کر سکے۔ جب وہ دیکھتی ہو تو اس بچے میں عجیب کشش پاتی ہے...... حلیمہ کو معلوم ہوا کہ محمدؐ نے ہاتھ بڑھا کر حلیمہ کا دل پکڑ لیا ہے...... اور اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

قارئین ناقابل یقین اور غیر معمولی معاوضے کو وصول کر کے حلیمہ خیمے میں پہنچتی ہے...... ننھے حضور کی آمد کی وجہ سے اس کے ہاں خیر و برکت کس طرح ڈیرا ڈال لیتی ہے پل پل پر حیران کر دینے والے کرشمے کیسے دکھائی دیتے ہیں، یہ سب ضرور پڑھیے......

اگلے ابواب بے پناہ معلوماتی، ادبی خزانہ سموئے ہوئے ہیں آپ اپنے بچپن کی تصویریں دیکھتے ہیں اپنے بچوں کے بچپن کی تصویریں اور اب (موویز) دیکھتے ہیں ذہن کے پردے پر ہر منظر دکھائی دیتا ہے یہ میرے ننھے حضور کا بچپن ہے......!

یہ بچپن مکہ سے بادیہ بنو سعد میں محبتیں سمیٹنے کیلئے پہنچتا ہے۔ کہیں حلیمہ سعدیہ کا خاوند حرث...... سینے سے لگاتا ہے چومتا ہے...... محمدؐ کی خاطر اپنے بیٹے عبداللہ کو نہیں بخشتا...... کہیں چرواہوں کے مذاق کا نشانہ بنتا ہے...... لیکن ننھے حضور کی محبت ہے کہ لحہ بہ لحہ بڑھتی چلی جاتی ہے...... ننھے حضورؐ کے ساتھ ساتھ خویلد کے گھرانے کی کہانی بھی زیب داستان بننا شروع ہو گئی ہے۔ خویلد اس کی شہزادیوں جیسی بیٹی خدیجہ کی داستان...... عربوں کی قتل و غارت گری، دشمنیوں کے قصے......

کتاب کے آخری ابواب میں آمنہ بنت وہب کی بیماری کی کہانی ہے کس طرح سے انہوں نے حالت مرض میں اپنے میکے کی اجازت طلب کی یثرب کو روانگی...... بوڑھے دادا کا انہیں الوداع کرنا......

عبدالمطلب اپنے پوتے سے کہہ رہے ہیں

اپنی والدہ کا خیال رکھنا بیٹا اب تم بڑے ہو گئے ہونا......

جی بابا...... ننھے حضورؐ نے دادا کو جواب دیا۔

اور بیٹا تمہیں معلوم ہے تمہاری اماں بڑی اداس رہتی ہیں انہیں پریشان نہ کرنا اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے اپنی ماں کو پریشان نہیں کرتے......

دادا نے بھینچ کر محمدؐ کو سینے سے لگا لیا ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے......

ننھے حضور کی ننھیال کا تعارف بہت دلچسپ ہے ایک جھلک ننھے حضور کی ننھیال بنو عدی کی معزز شاخ سے تھے اور یثرب کے باعزت لوگوں میں شمار ہوتے تھے تجارت تو یونہی نام کو تھی لیکن یثرب کا معزز پیشہ زراعت تھا کھجوروں کی لمبی لمبی قطاریں عرب کے نواح میں باغات کی صورت میں موجود تھیں یثرب میں 125 قسم کی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں ان میں ایک کھجور بغیر گٹھلی ہوتی تھی یہ صرف عرب ہی نہیں بلکہ دور دراز کے علاقوں روم اور شام میں بھی مشہور تھی لوگ محض یہ کھجور کھانے یثرب آیا کرتے تھے ننھے حضور ننھیال کے باغات میں ایسی کھجور ہی پیدا ہوتی تھی۔

یثرب کے قیام میں بر کہ وطن کو یاد کر کے اداس لیکن مالکن بہت خوش تھیں...... اپنوں سے ملنے کی خوشی پر بالآخر شوہر کی جدائی کا دکھ غالب آ گیا اور کتاب کے آخری صفحات اسی کرب پر مشتمل ہیں۔

آمنہ اپنی شخصیت کے عمق میں گہری...... گہری اترتی چلی گئیں یہاں تک کہ ان کا اکلوتا بھی ان کے لئے بیگانہ ہو گیا۔ وہ صبح تھوڑا بہت کھا کر قبرستان چل جاتیں، دن بھر شہر خموشاں کے سناٹوں میں گزار دیتیں، ذہن کے اس یک سمتی بہاؤ نے انہیں شاعرہ بنا دیا......اور انہوں نے عبداللہ کے مرثیے کہنا شروع کر دیئے۔

یہی مرثیے بیرونی دنیا کے ساتھ آمنہ کا واحد رشتہ رہ گئے۔

قارئین کتاب ساری کی ساری کلائمکس سے بھری ہے...... ہر چیز بہت رکھ رکھاؤ اور سلیقے پر مشتمل ہے...... کتاب پڑھ کر قاری ایک دفعہ ضرور آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہوتا ہے...... ذہن کو یکسو کرتا ہے...... ذہن میں ایک منظر آتا ہے۔

ننھے حضور...... دُرِ یتیم...... آمنہ کا لعل بھی کبھی آغوں آغوں کرتا ہوگا...... ایڑیوں کے بل گھسٹتا ہوگا...... پھر پاؤں پاؤں چلتا ہوگا۔ توتلی زبان میں کچھ نہ کچھ تو بولتا ہوگا۔

یہ منظر ذہن میں لانے کے لیے کتاب کا مطالعہ بے حد کارساز ہو گا ہاں کتاب پڑھیئے ضرور......اس کے بعد تاثرات سے آگاہی دینا بھی مطالعے کا ہی حصہ ہوتا ہے۔

کتاب خریدیئے، کتاب دوست بنیئے۔ اگلے کالم تک اجازت، فی امان اللہ۔

☆......☆......☆

فرحت طاہر

یادوں کے چراغ جلاؤ کہ روشنی ہو!

یہ عنوان تھا بینر کا اور خاص اس تقریب کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا جو اولین نگران حریم ادب محترمہ عذرا جمال کی یاد میں منعقد کی جا رہی تھی۔ چراغ روشنی کا استعارہ ہے جو رہنمائی کرتا ہے۔ بس یہ ہی سوچ کر اس عنوان کے تحت اپنی محفل مرتب کرنے کا پروگرام طے کرلیا۔

تقریب کے انعقاد کا قصہ کچھ یوں ہے کہ اجتماع عام میں حریم ادب کا اسٹال مرکزی شعبہ جات کے ساتھ تھا۔ اس پر ہم نے پرانے مجلّے رکھے تھے۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے انجم خالق نے عذرا جمال کے افسانوں کو دکھاتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا کہ یہ میری امی کا لکھا ہوا ہے! جس وقت وہ یہ کہہ رہی تھیں ان کا چہرہ دمک رہا تھا 'یہ میری امی نے بنایا ہے!' والا فخر یہ جملہ جو ہر بچہ ضرور اپنی ماں کے بارے میں کہتا ہے صاف نمایاں تھا۔ انجم خالق اور شاہینہ احمد سے بہت پرانا تعلق ہے مگر عذرا جمال کی بیٹیاں ہونے کی خبر نے جیسے کڑیاں جوڑ دیں ماں کی تربیت اولاد میں ضرور جھلکتی ہے! اسی وقت انجم خالق نے اپنی امی کی یاد میں ایک نشست رکھنے کی پیشکش کی جو ہم نے فوراً قبول کر لی۔

اجتماع سے واپسی پر تھکن اتارنے کے بعد جیسے ہی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی سانحہ پشاور نے ہم سب کی قوتیں سلب کرلیں اور پھر اس کی وجہ سے تعطیلات میں اضافہ کے باعث پروگرام کے انعقاد میں تاخیر ہوتی گئی۔ بہر حال جنوری کی ۲۴ تاریخ ہم نے باہم مشورے سے طے کرلی۔ اس دوران جتنی خواتین سے رابطہ ممکن اور ضروری تھا کرتے رہے۔ ای میل، فیس بک رموبائیل پیغامات کے ساتھ ساتھ براہ راست فون کے علاوہ اخبار میں بھی اطلاع دے دی۔ کافی حوصلہ افزا ردِّ عمل تھا۔ عذرا جمال کی شخصیت ایک قوس وقزح کی مانند ہے لہٰذا جتنے رنگ اتنے ہی طرح کے شرکاء! خاندان سے لے کر احباب، معاشرتی سے لے کر ادبی محاذ کے ساتھی.....

ہم نے بھی حریم ادب کے نگران کی حیثیت سے اپنی معلومات کو تازہ کیا۔ مجلّے (جو بڑی مشکل سے دستیاب ہوئے تھے) کے مطابق حریم ادب ۱۳ر جنوری ۱۹۸۴ء کو ایک منظّم ادارہ بن کر نمودار ہوئی۔ کراچی میں عذرا جمال کے گھر پہلا بڑا اجتماع ہوا جس میں پورے ملک سے قلمکاروں نے شرکت کی۔ باقاعدہ انتخاب کے ذریعے عذرا جمال نگران، عقیلہ اظہر صدر، فریدہ ظہیر جنرل سیکریٹری منتخب ہوئیں۔ جیسا کہ ہم سب کے علم میں ہے کہ بارش کے ہونے سے پہلے فضا کیسے تیار ہوتی ہے! سورج، ہوا، بادل، بخارات بارش سے بہت پہلے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں! بالکل اسی طرح سے ادبی محاذ بہت پہلے سے سرگرم تھا اور قلم کے مجاہدین اپنے جوہر دکھا رہے تھے مگر اب ایک منفرد نام کے ساتھ باقاعدہ آغاز ہوا۔ ان معلومات کو پڑھ کر خوشی ہوئی اور حسن اتفاق کہ حریم ادب کی یادگاری محفل بھی ماہ جنوری میں منعقد ہو رہی تھی۔

پروگرام کا وقت بارہ بجے رکھا گیا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شرکاء کی اچھی خاصی تعداد وقت کی پابندی پر عمل کرتے ہوئے موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ قلم کاروں کا ایک قافلہ غزالہ عزیز کی رہنمائی میں کراچی جنوبی سے روانہ ہو چکا ہے چنانچہ ان کی آمد تک ہم سب آپس میں ملاقاتیں کرتے رہے۔ شرکاء بڑی دلچسپی سے نشست کے باقاعدہ آغاز کے منتظر تھے۔ ہال کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ تخت پر خوبصورت جھالر کے ساتھ لگے گاؤ تکیے میزبانوں کے ذوق کا مظہر تھا تو اس کے اوپر آویزاں تہنیتی بینر جو اس تقریب کے لیے خصوصی طور ڈیزائن کیا گیا تھا شرکاء کے جذبہ شوق کو بھڑکا رہا تھا۔ تخت کے دوطرف کرسیاں لگی تھیں جبکہ خوبصورت فرشی نشست کے درمیان میں سبز اور گولڈن آرائشی جھالر بچھی جس پر گلدستہ رکھا تھا۔ اردگرد کشن پر مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ

تھی۔کشادگی کا احساس لیے نشست گاہ میں آسودگی اور رونق باہم موجود تھے! مناسب آرائش کے ساتھ ایک بے تکلفی اور اپنائیت کا ماحول تھا بناوٹ اور مصنوعیت سے پاک! شاید یہ اس شخصیت کے مزاج کا پرتو تھا جس کی یاد میں محفل سجائی گئی تھی۔

دائیں طرف پوسٹرز لگے تھے جن میں حریم ادب کے مقاصد اور اولین قلمکاروں اور ادب کی آبیاری کرنے والوں کے نام جگمگا رہے تھے۔ بنت الاسلام،، نیر بانو، حمیدہ بیگم، امّ زبیر، رخشندہ کوکب، بنت مینا مجتبٰی، عذرا جمال.......گویا پوری کہکشاں تھی! اس کے علاوہ دیگر جگمگ ستاروں کی فہرست بھی لگی تھی! بچوں نے ہر نام کے آگے ستارہ لگا کر واقعی چمک پیدا کردی تھی۔

مہمان خصوصی آسیہ بنت عبداللہ صدیقی کی آمد کے ساتھ ہی گویا محفل میں جان پڑ گئی۔ایک لمبے سفر کی تھکان کی وجہ سے وہ تخت پر نیم دراز ہوگئیں تو ایسا لگا کہ ان کے ناول کا کردار صفحات سے نکل کر حقیقی دنیا میں آ گیا ہو! اور اس پر ان کی بذلہ سنجی ماحول کو خوشگوار بنا رہی تھی۔انہوں نے حریم ادب کے بارے میں اپنی ایک تازہ نظم سنا کر داد وصول کی.....مگر یہ تو محفل کے اختتام پر ہوا تھا! ابھی تو آغاز کرنا تھا جو مازیہ کی سورہ رحمٰن کی خوبصورت تلاوت سے ہوا۔اس کے بعد تعارف اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔نظامت کی ذمہ داری غزالہ عزیز کے ذمہ تھی۔انہوں نے افتتاحی کلمات کے لیے ہمیں آواز دی تو ہم نے اپنے خوشگوار احساسات کو زبان دی جو اس محفل کے انعقاد پر طاری ہوئے تھے! اس خوبصورت اور پرفضا پہاڑی علاقے میں سمندر کے کنارے سے افراد کا جوق در جوق آنا ان کے جوش و خروش کو واضح کرتا ہے۔

اس کے بعد سب کے تعارف اور تاثرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ دونوں بہوؤں صولت اور مریم نے ان کے معمولات کی زبردست منظر کشی کی

پوتیوں حرا، امیمہ، مدیحہ، ملیحہ نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ ان کی دادی ان سب کے نام پر نظمیں لکھ کر نور میں شائع کرواتی تھیں۔ اچھی باتیں بتاتی تھیں۔ اگر وہ آج زندہ ہوتیں تو ہمیں اپنے بچوں کی پرورش میں کتنی رہنمائی ملتی (اس بات کی تائید ان کے بچے اپنی اپنی زبان میں کررہے تھے!) نواسی روحا نے اسکائپ کے ذریعے اپنی والدہ شبانہ سے اس محفل میں شرکت کروائی۔ان سب کا کہنا تھا کہ وہ کام سکھانے میں معاونت اور حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ان کے ساتھیوں میں سے تحسین فاطمہ نے ان کی رہنمائی اور نصیحت کے دلنشین انداز کا ذکر کیا۔شاہدہ خاتون کے علاوہ ان کے پڑوسیوں اور بہت سی ساتھیوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

یہ بات تو طے ہے کہ ادبی محفلیں صرف اور صرف نگارشات سننے سنانے کی محفل نہیں ہوتی بلکہ تفریح طبع اور ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ معاشرتی تقاضوں سے بھی نبرد آزما ہوتی ہے۔ رشتوں کی تلاش سے جانبین کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے تک، ملاقاتوں کے اہتمام سے لے کر خوش اسلوبی سے تقریب کی تشکیل تک! گھریلو ٹوٹکوں اور مشوروں سے لے کر رشتوں کے درمیان ہونے والی بدمزگیوں کے ازالے کس طرح ان ہی محفلوں میں طے ہوتے تھے! ان تمام کی گواہی فاطمہ زہرہ سمیت کئی شرکاء نے کی۔ ریحانہ افروز ان کی محبت میں سرشار تھیں تو شگفتہ مشہود بھی اس کی اسیر نظر آئیں۔ان کی خوبیاں موضوع گفتگو رہیں مہمان نوازی، خوش خلقی.......جن کا ذکر اس مختصر روداد میں ممکن نہیں!

چھوٹی صاحبزادی شاہینہ کا کہنا تھا کہ وہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے امی کی ادبی محفلوں میں شرکت سے محروم رہیں (اس کا ازالہ اب کرسکتی ہیں!)۔اور جب باری آئی انجم خالق کی جو اس تقریب کی میزبان تھیں تو ان کی آواز رندھ گئی یہ کہتے ہوئے کہ....میں کیا کہوں اس کے سوا کہ وہ میری ماں تھیں.....واقعی ایک شاندار ماں کی اولادیں کس کڑے پیمانے میں جانچی جاتی ہیں ان کی اقدار کو آگے بڑھانے میں! (ان کی اس بات پر ہمارا بھی دل دھڑکا کہ حقیقی اولاد کے ساتھ ساتھ روحانی اولادوں کا بھی تو امتحان ہے کہ وہ ان اوصاف کی حامل ہیں کہ نہیں؟ ان کا سا حوصلہ، تدّبر، اخلاص، حکمت اور دلجمعی ہے کہ نہیں؟ سوالات کے آئینے میں خود کو بہت کمزور تصور کیا!) اس بات کا اظہار افشاں نوید نے اپنی گفتگو میں کیا کہ ہمارا فرض ہے کہ اپنے محسنوں کو یاد رکھیں اور ان کے کام کو آگے بڑھائیں! ہمیں اپنی اس شاندار حامل

کی روایات وراثت کو بہترین طریقے سے آگے منتقل کرنا ہے! انہوں نے عذرا جمال کی موثر اور مربوط حکمت عملیوں کا تذکرہ کرکے شرکاء کی کافی رہنمائی کی۔

فریحہ اشرف جو بچپن سے ان کی ادبی محفلوں میں شریک ہوئی تھیں نے ان کا ذکر کر کے سماں باندھ دیا۔صائمہ افتخار بھی ان سے فیض پانے والوں میں سے ہیں۔توقیر عائشہ بھی ان سے ملاقات کاشرف حاصل کر چکی ہیں۔ان سے براہ راست ملاقات کرنے والے شرکاء کے علاوہ قلمکاروں کی کثیر تعداد ایسی تھی جو عذرا جمال سے کبھی نہ مل سکی تھی مگر اس محفل کے ذریعے ان کی شخصیت کو اپنے لیے مشعل راہ بنا رہی تھی۔ان میں نگہت یاسمین،طوبیٰ احسن،فرح نعیم،نیّر سلطانہ،رضوانہ نعیم،صائمہ سرفراز ان کی نادیدہ مدّاح تھیں۔ان کے علاوہ نوخیز قلمکار ایمن،مریم کے علاوہ بچوں کی کثیر تعداد موجود تھی جو اپنے درمیان اپنی پسندیدہ مصنفہ غزالہ ارشد کو پاکر خوشی سے نہال تھی۔خود غزالہ بھی تقریب میں کافی پر جوش نظر آئیں۔

آخر میں افشاں نوید نے جامع اور موثر دعا کروائی۔عموماً تقریبات میں شرکاء کو دعوتی رقعہ بھیجا جاتا ہے مگر اس محفل کی انفرادیت یہ تھی کہ یہاں ان کو 'حریم ادب ایک خزانہ ہے' کے عنوان سے یادگاری رقعے دیے گئے! محبت اور محنت سے تیار کردہ یہ رقعے یقیناً ان کو اس محفل کی یاد دلاتے رہیں گے ان شاء اللہ! پھولوں کی تقسیم بھی ایک خوبصورت روایت ہے ان محفلوں کی! شرکاء آسیہ بنت عبداللہ کا ناول دلشکن تحفے میں پاکر بہت خوش نظر آئے۔اس تقریب کے اکثر شرکاء اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ کر آئے تھے۔کچھ نے آنے کی خوشی میں ہلکا پھلکا سا ناشتہ کیا تھا یا مصروفیات کے باعث کر ہی نہ پائے ہوں گے مگر اس محفل میں سے اٹھ کر جانے یا مختصر کرنے پر راضی نہ ہوئے اور ایسی محفل ہر ماہ منعقد کرنے کی فرمائش کرتے نظر آئے۔ہماری ہچکچاہٹ اور ان کا اصرار بالآخر سہ ماہی سے سالانہ پر طے ہوا۔

اور معزز قارئین!

اس محفل میں لذت طعام کے لیے میزبانوں کی طرف سے بھرپور انتظام تھا۔حلیم، چھولے، پزا، کسٹرڈ ......گویا مشرقی اور مغربی غذا کا امتزاج! اس کے مزے اٹھاتے ہوئے شرکا بہت لطف اندوز ہوئے۔ایسی پرسکون اور محفل صرف یادگار نہیں بلکہ واقعی روشنی اور توانائی کا باعث بنتی ہے!

☆......☆......☆

غزالہ عزیز

میری لائبریری سے

یہ کتاب جواب اکثر میرے سرہانے ہوتی ہے کہ اسے واپس شیلف میں رکھنے کو دل نہیں چاہتا وہ ہے ڈاکٹر محمد بن عبدالرحمٰن العریفی کی کتاب ''زندگی سے لطف اٹھایئے۔'' اس کتاب کا موضوع انسانی مسائل اور ان کا حل ہے۔ یہ حل اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں زندگی گزارنے کے سنہرے اصول اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بتائے گئے ہیں۔

چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ کریں اپنے آپ کو ترقی دیں، نمایاں بنئے، مہارتوں سے لطف اٹھایئے، نام یاد رکھیں، استاد بننے کی کوششیں نہ کریں، ہم اختلاف کرتے ہیں اس کے باوجود دوست ہیں......وغیرہ وغیرہ

عنوانات اگرچہ طویل نہیں لیکن مضامین میں چھوٹے چھوٹے جملوں کے ساتھ مسئلہ کی گرہ کھولی گئی ہے۔ ہر مضمون کے آخر میں نتیجہ ضرور بتایا گیا ہے جو اس مضمون کے مطالعہ کے بعد آخر میں پڑھ کر آپ کو ضرور ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے زندگی کو بہتر سے بہتر گزارنے کیلئے آپ نے کوئی ایک اہم نکتہ ذہن نشین کرلیا ہے۔ ڈاکٹر محمد العریفی سعودی عرب کے اصل باشندے ہیں ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے بنو خالد (بنو مخزوم) سے ہے اور یہ بات تو پھر آپ سب سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ وہ بنو خالد کے مشہور سپہ سالار مجاہد اور صحابی حضرت خالد بن ولید کی اولاد ہیں۔ عربی زبان میں ان کی یہ کتاب اگست 2007ء میں شائع ہوئی محض ایک سال میں اس کے دس لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے ڈاکٹر صاحب بیس سے زیادہ کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ ایک کتاب جو توحید کے موضوع پر ہے ''ارکب معنا'' جس کے 40 لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''دارالسلام'' اشاعتی ادارے نے شائع کی ہے اس کتاب کے بارے میں مصنف خود لکھتے ہیں کہ اگرچہ میری چند کتابوں کے بعض ایڈیشن بیس لاکھ نسخوں سے زیادہ ہیں لیکن حقیقت میں مجھے یہ کتاب اپنی تمام کتابوں سے زیادہ پیاری اور نفیس معلوم ہوتی ہے۔ عملی فوائد کے اعتبار سے بھی یہ کتاب جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری ساری کتابوں سے فزوں تر ہے یہ ایک مہینے یا ایک سال کی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ثمرہ ہے میری ان تحقیقات کا جن پر میں نے اپنی زندگی کے بیس قیمتی سال صرف کیے۔ مصنف اس کتاب کی غرض بتاتے ہیں کہ ''غرض یہ نہیں کہ آپ محض ایک کتاب پڑھ ڈالیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں۔''

ڈاکٹر صاحب ایک مضمون ''مسکراؤ...... پھر مسکراؤ...... مسکراتے جاؤ'' میں سیرت کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک دن نبیؐ کسی کام سے جا رہے تھے۔ انسؓ بن مالک بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ نبیؐ نے موٹے کنارے والی نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی راستے میں ایک اعرابی دونوں کے پیچھے چلتا ہوا آیا۔ وہ نبیؐ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو نبیؐ کی چادر کا پلو اُس کے ہاتھ آگیا۔ اس نے چادر کو ایک جھٹکے سے کھینچا۔ حضرت انسؓ بتاتے ہیں کہ اس بدو نے چادر اس شدت سے کھینچی کہ نبیؐ کی گردن پر رگڑ کے نشان پڑ گئے۔ یہ بدو کیا چاہتا تھا؟ آپ سوچتے ہوں گے کہ وہ کسی نہایت ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوگا۔

شاید اس کا گھر جل رہا تھا اور وہ مدد مانگنے آیا تھا؟ یا اس کے قبیلے کو مشرکین کی طرف سے کسی حملے کا اندیشہ تھا اور وہ ان کے خلاف تعاون حاصل کرنے آیا تھا؟

نہیں ایسا بالکل نہیں تھا۔

اس نے چھوٹتے ہی کہا اے محمدؐ (یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اس نے احتراماً اے اللہ کے رسول نہیں کہا) بلکہ نہایت درشت لہجے میں بولا ''اے محمدؐ تمہارے پاس جو اللہ کا مال ہے اُس میں سے مجھے بھی کچھ دو۔''

رسول اللہ نے مڑ کر دیکھا اور ''مسکرا دیئے۔'' پھر حکم دیا کہ اسے کچھ دیا جائے۔

جی ہاں رسولؐ اللہ ایک بہادر انسان تھے۔ اس نوع کا برتاؤ انہیں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ معمولی باتوں پر نہ آپؐ کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا اور نہ آپ ان کا بدلہ لیتے تھے۔

رسولؐ اللہ حد درجہ نرم دل تھے۔ آپ قوی اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ بدترین حالات میں بھی مسکراتے تھے۔ کام کرنے سے قبل اس کے انجام پر غور کرتے۔ اندازہ کیجئے کہ اگر رسولؐ اللہ اس اعرابی پر بگڑ جاتے یا اسے دھتکار دیتے تو نتیجہ کیا نکلتا کیا ایسا رویہ اختیار کرنے سے نبیؐ کی گردن کا زخم ٹھیک ہو جاتا؟ یا بدو تقاضا کرنے کا ڈھنگ سیکھ جاتا؟

دیکھا آپ نے قارئین کہ کیسے ڈاکٹر صاحب مشکل حالات میں مسکرانے اور مسکراتے رہنا رسولؐ اللہ کی سنت کے ذریعے سکھاتے ہیں۔

یہ ایک مضمون کے چند پیراگراف ہیں۔ پانچ سو پچھتر صفحات کی اس کتاب میں ایسے کتنے ہی انمول موتی اور ہیرے ہیں جن کی جگمگاہٹ سے آپ اپنی شخصیت کو خیرہ کن بنا سکتے ہیں۔ اپنی زندگی سے لطف اٹھانے کا ڈھنگ بھی سیکھ سکتے ہیں۔ اس میں پیچیدہ مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں اس میں بہت آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

عربی سے اُردو کے قالب میں ''حافظ قمر حسن'' صاحب نے بہت خوبصورت انداز میں ڈھالا ہے۔ انداز تحریر میں عربی چاشنی اور فصاحت خب محسوس کی جا سکتی ہے۔

اس کے مطالعہ سے آپ ڈیل کارنیگی جیسے دنیا کے پرستار کی کتب سے بے نیاز ہو جائیں گے جو اوروں کو ''راہ نمائی'' فراہم کرتے کرتے خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کی زندگی سچی روحانیت سے خالی تھی۔

عزیز و اقارب اور دوستوں کو مطالعے کی ترغیب دینے کے لیے یہ کتاب ایک بہترین تحفہ ہے۔

☆......☆......☆

ذکیہ فرحت

کل کس نے دیکھا ہے!

دفاعِ وطن وہ چیز ہے جس کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ ملک کے دفاع کی خاطر نوجوانوں پر مشتمل اسکاؤٹ کی تنظیمیں بنتی ہیں۔ شہری دفاع کے محکمے بنائے جاتے ہیں۔ اور پھر بڑے پیمانے پر ملک کے دفاع کے لیے ایک مکمل فوج تیار کی جاتی ہے جو ہر وقت کسی بھی طرف سے کسی بھی قسم کے حملے سے بچاؤ کے لیے ہر وقت چوکس رہتی ہیں جن کی صحت وتوانائی اور طاقت کو بحال رکھنے کے لیے اوران کی تربیت کے لیے کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ دنیا کا ہر ملک میں نہ صرف اس کا اہتمام ہوتا ہے بلکہ جو سپاہی اس جذبے سے جتنا سرشار ہوتا ہے! ملک کے لیے جتنا سرفروش ہوتا ہے اس کی اتنی ہی قدر افزائی کی جاتی ہے، اسے تمغوں سے نوازا جاتا ہے وہ ملک کا مایہ ناز سپاہی سمجھا جاتا ہے اور پوری قوم اس پر فخر کرتی ہے...... بچپن سے ہی ہر بچے کو دفاعِ وطن کی تعلیم اور ترغیب دی جاتی ہے تاکہ وہ آگے بڑھ کر بہترین سپاہی ثابت ہو لیکن......

پاکستان وہ ملک ہے جہاں دفاعِ وطن جرم بن گیا ہے اور اس کی مثال بنگلہ دیش ہے جو کبھی مشرقی پاکستان تھا۔ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ...... ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء وہ سیاہ ترین دن ہے جس میں سقوطِ ڈھاکہ ہوا۔ ڈھاکہ شہر میں خون کی ندیاں بہادی گئیں۔ ۹۰ ہزار پاکستانی فوج نے اپنے چیف کمانڈر کے ساتھ دشمن انڈیا کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے اور دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ پاکستان کی مایہ ناز فوج کا وہ کمانڈر جو ایک دن پہلے تک دشمن کو للکار رہا تھا دشمن فوج کے سربراہ کے ساتھ معاہدے پر دستخط کر رہا تھا افسوس کہ ؎ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے، اور اسی لمحے ڈھاکہ بلکہ پورا مشرقی پاکستان دشمن کے زیرِ نگیں آ گیا۔ پاکستانی قوم دشمن کی غلام بنا دی گئی اور دن بدن اس غلامی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسی واقعے کو سقوطِ ڈھاکہ کہا جاتا ہے...... پہلے مشرقی پاکستانیوں کو جان بوجھ کر محرومی میں مبتلا کیا گیا اور جب بنگالیوں نے احساسِ محرومی کا شکار ہو کر مجیب الرحمٰن کی سربراہی میں سونار بنگلہ کا نعرہ لگایا تو اول تو اس جذبے کو ڈھیل دی گئی اور پھر اسے بزور فوج دبانے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں پوری بنگالی قوم ایک بپھرا ہوا سمندر بن کر پاکستان کے خلاف ہوگئی۔ اپنی ہی قوم کے لوگوں کا قتل کیا جانے لگا۔ بنگالیوں کے ہاتھوں غیر بنگالیوں کے جان و مال غیر محفوظ ہوگئے۔ شب و روز ہزاروں لوگ مارے جانے لگے......

ان حالات میں وہ لوگ جو محبِّ وطن تھے، اپنے ملک پاکستان سے محبت رکھتے تھے، پاکستان کا ٹوٹنا اور قوم پر ظلم توڑا جانا جنھیں گوارا نہ تھا وہ آگے بڑھے۔ اپنی جانوں پر کھیل کر ہزاروں لوگوں کی جانیں بچائیں انھیں دشمنوں کے نرغے سے نکالا۔ نوجوانوں نے اپنی خدمات پیش کیں ان پر مشتمل البدر اور الشمس نام کی تنظیمیں بنائی گئیں اور اس تنظیم کے ہزاروں نوجوانوں نے لوگوں کی جانیں بچاتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ دفاعِ وطن کے اس جذبے کے تحت انھوں نے پاکستانی فوج کی بھی مدد کی۔ ان کے ساتھ مل کر مختلف اہم فرائض بھی انجام دیے۔ راتوں کو گھروں میں پہرے بھی دیے اور مصیبت کے وقت ان کے جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت بھی کی۔

لیکن افسوس کہ آج وطن کے دفاع کا یہی جذبہ سب سے بڑا جرم ٹھہرا ہے اور وہ لوگ جو اس میں پیش پیش تھے جن لوگوں نے سب سے زیادہ اپنی جان اور اپنا خون پیش کیا تھا چن چن کر پھانسی پر چڑھائے جا رہے ہیں۔ ہزاروں کو حوالۂ زنداں کر دیا گیا ہے۔ کئی تختۂ دار پر چڑھائے جا چکے اور کتنوں کی پھانسی کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ مجیب کی بیٹی حسینہ واجد

جو باپ کی جگہ عوامی لیگ کی سربراہ ہے دشمن انڈیا کی آلۂ کار بن کر ان محبّ وطن لوگوں کو جو پاکستان کے دلدادہ اور اس کے سب سے بڑے محافظ تھے دشمن بن بیٹھی ہے اس جرم میں کہ انھوں نے پاکستان کو بچانے کے لیے بنگلہ دیش کی مخالفت کی تھی۔ یقیناً ایسا ہی تھا اور ہر محبّ وطن ایسا ہی کرتا ہے۔ یہ جذبہ تو ایک ابدی جذبہ ہے۔ یہ کبھی سرد نہیں پڑتا اور نہ کبھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا معلوم کہ جس بنگلہ دیش کی حمایت نہ کرنے والوں کو پھانسیوں کا تحفہ دیا جا رہا ہے کل وہی دیش کسی اور دشمنی کے ہتھے چڑھ کر کوئی اور ملک بن جائے اور پھر بنگلہ دیشی ہونا بھی اس سرزمین پر جرم ٹھہرے!

قدرت کے کارخانے میں ایسے عجائبات کی کمی تو نہیں؟ کل جس روس میں کمیونزم کو پھیلانے کے لیے اسلام پسندوں کا کمیونسٹوں نے قتل عام کیا تھا اور جو کئی اسلامی ریاستوں پر قابض ہو کر سویت یونین کہلاتا تھا آج صرف ماسکو تک سمٹ گیا ہے اور کمیونزم کے بانی اسٹالن کا وہ مجسمہ جو اسٹالن گراڈ کے چوراہے پر نصب تھا مسمار کر دیا گیا ہے...... دیوار برلن جو دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی توڑ ڈالی گئی اور اب مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی دونوں ایک ہو گئے ہیں۔ کیا عجب کل کو پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازو بھی پھر سے ایک ہو جائیں! پھر آج یہ دفاع وطن کو جرم قرار دینے والے کل کہاں کھڑے ہوں گے؟؟؟

☆......☆......☆

تزئین فیصل

خیر کے ننھے سفیر

میں بحثیت ماں ایک انجانے خوف میں گرفتار ہوں کہ اپنے بچوں کو اسکول کیسے بھیجوں گی۔ کیسے میں پاکستان میں موجود ہر ماں کے دل سے اس خوف کو نکال دوں اور دفاع پاکستان کے لئے مثبت سوچ دوں۔ مگر میں یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ کیونکہ انسانی معاشرہ حیات و موت کی کشمکش سے دوچار ہے؟ کیونکہ جنگ کو ہم پر مسلط کیا جارہا ہے؟ کیوں انسانی خون بارود کے سیاہ دھوئیں میں تبدیل ہوتا جارہا ہے؟ کیوں دنیا بھر کے پرامن لوگوں کا سکون دیوار سے جالگا ہے؟

لیکن ہمارے ذرائع ابلاغ کا یہ حال ہے کہ یہاں ہمارا کام یہ تلاش کرنا نہیں ہے کہ سچ کیا ہے بلکہ ہمارا کام یہ تلاش کرنا ہے کہ وہ سچ کیا ہے جو ہمیں درکار ہے۔ کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عدم تحفظ کا خوف بھی ایک طاقت بن جاتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم جس خوف کی وجہ سے ایک خوف کو ختم کرتے ہیں، وہی خوف ہماری فنا کا سبب بن جاتا ہے۔ گویا ذرائع ابلاغ سچ کا نہیں خوف کا تماشا ہے، اور خوف کے اس تماشے میں ہم سچ کی وہی شکل سامنے لاتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں ہر کوئی اپنی معقولیت کو منوانے کے لئے ایک دوسرے کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔

حکمرانی کا خواب دیکھنے والی قوتیں انسانوں اور انسانیت کی دھجیاں بکھیرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟ حق کیا ہے، ناحق کیا ہے؟ ظالم کون ہے؟ مظلوم کون ہے؟ اس تفتیش میں کون پڑے! اور کیا ان تمام حقائق کو جان کر میرے خوف کا سدباب ہوجائے گا؟ میں امن وسکون کا پیغام دینا چاہتی تھی لیکن کیسے؟ ابھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ میرے بچے میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے:

مما، آپ کیا لکھ رہی ہیں؟

بیٹا میں دفاع پاکستان پر لکھ رہی ہوں۔

کیا مطلب؟

مطلب یہ کہ اسکولوں میں جو بچوں کو مارا گیا ہے، ہم اس کا دفاع کیسے کریں۔

مما وہ تو مجھے پتہ ہے، جیسے ہی وہ لوگ Guns لے کر آئیں تو ہمیں ٹیبل کے نیچے الٹے لیٹ جانا چاہیے اور بالکل آواز نہیں نکالنا چاہیے، جیسے کہ ہم مرگئے ہوں جب تک کوئی ٹیچر یا مما، بابا آپ کو لینے نہ آجائیں۔

مما وہ کون لوگ تھے جنہوں نے بچوں کو مارا؟

بیٹا وہ گندے لوگ تھے۔

گندے لوگوں نے بچوں کو کیوں مارا؟

بیٹا وہ ہم سے اپنے بچوں کا بدلہ/انتقام لینا چاہتے تھے اور ہم سے ناراض تھے۔

کیوں ناراض تھے؟

کیونکہ کچھ گندے لوگوں نے ان کے بچوں پر بھی بم پھینکے تھے اور انہیں مارا تھا۔

اوہو، تو مما کیا اب وہ ہمارے اسکول میں بھی بم پھینک کر ہم کو ماریں گے۔

''اللہ نہ کرے'' یہ سن کر ہی میں نے اپنے بچوں کو اپنی آغوش میں چھپالیا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

مما آپ کیوں رو رہی ہیں؟

بیٹا میں آپ سے بھی اور تمام بچوں سے چاہے وہ میرے ہوں یا ان کے بہت محبت کرتی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ گندے لوگ ہم کو اپنی نفرت میں شامل کریں۔لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ اس کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

مما ہم اک کام کرتے ہیں۔۔ہم ان سے دوستی کر لیتے ہیں اور اچھے بچوں کی طرح مل جل کر رہتے ہیں آپ ان گندے لوگوں کو دوستی کا خط لکھ دیں اور انہیں بتائیں کہ مسلمان کا مسلمان سے لڑنا بری بات ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے پھر وہ بھی اچھے بن جائیں۔

لیکن اگر انہوں نے ہماری دوستی قبول نہ کی اور اچھے بچے نہ بنے تو؟

آپ خود تو کہتی ہیں کہ جیت ہمیشہ اچھے بچوں کی ہوتی ہے، ہمیں صرف اچھے بننے کی کوشش کرنی چاہیے اور نتائج کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔اور ہاں مما آپ گندے لوگوں سے بم لے کر توڑ دیں، نہ بم ہوگا اور نہ ہم ایک دوسرے کو ماریں گے۔

یہ کہتے ہوئے میرے بچے باہر کھیلنے چلے گئے، اور میں سوچتی رہ گئی کہ یہ بچے مجھے عقیدہ کی بنیاد پر کتنا پرعزم اور صاف وشفاف حل دیکر چلے گئے۔ان معصوم بچوں کا یقین خداوند تعالیٰ پر اور خیر پر کتنا پختہ ہے کہ خیر ہمیشہ شر پر غالب رہتا ہے۔بس خیر کو پھیلائیں اور اللہ کے نظام کو دنیا پر غالب کرتے چلے جائیں۔ان معصوم ذہنوں کا نظریہ انسان دشمنی پر مبنی نہیں تھا، انہوں نے گناہ گار سے نفرت کا اظہار کر کے اسے ایک گناہ آلودہ Box میں بند نہیں کیا بلکہ صرف اس کے گناہ سے کراہیت محسوس کی اور توکل کا کتنا پیارا مفہوم سمجھا دیا کہ اسباب اختیار کرتے ہوئے نتائج کو مسبّب الاسباب پر چھوڑ دینے کا نام ہی توکل ہے۔زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کے حکم کے بغیر تو ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔لہٰذا موت جو کہ برحق ہے اس سے کیا خوف کھانا! ہم نے اپنی نئی نسل کو بزدل نہیں بنانا بلکہ بحیثیت والدین سب سے اچھا تحفہ جو ہم اپنے بچوں کو دے سکتے ہیں وہ زیور تعلیم ہے۔اگر آپ نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم جو خیر پر مبنی ہو، دے دی تو گویا ایک اچھے معاشرے کی بنیاد رکھ دی اور ایک اکائی کی صورت میں دفاع پاکستان کے لئے اپنا حصہ ڈال دیا۔

آخر میں تمام اچھے انسانوں سے درخواست ہے کہ ہم تمام ایٹمی اور دیگر مہلک ہتھیاروں کے ہر ایسے استعمال پر مکمل پابندی کا مطالبہ کریں جو انسانی آبادی کو تہس نہس کرنے والا ہو۔ ہر اس حکومت کی مذمت کریں جو کسی بھی ملک کے باشندوں پر بم گرانے کی جسارت کرتی ہے۔کیونکہ امن سارے براعظموں کے لئے ہے، سارے شہروں کے لئے ہے، سارے بچوں کے لئے ہے، اور انسانیت کی بقا کے لئے ہے۔

☆......☆......☆

مصطفیٰ محمد طحان

سعید بن عامرؓ

حمص کے باشندوں نے ایک مرتبہ اپنے گورنر سعید بن عامرؓ کے بارے میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ کو شکایت کی۔ انہوں نے چار اشیاء بتائیں کہ ان کے بارے میں انہیں شکایت ہے۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے فریقین کو یکجا بٹھایا اور اللہ سے دعا کی کہ سعید کے بارے میں میری رائے غلط نہ ہو، میں تو ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔

میں نے کہا: ''تمہیں اپنے امیر سے کیا شکایت ہے؟''

انہوں نے کہا: ''یہ دن چڑھے ہی گھر سے نکلتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''سعید! اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر کہا: ''خدا کی قسم! میں یہ ظاہر کرنا برا سمجھتا ہوں لیکن اب ضروری ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے اہل خانہ کا کوئی نوکر نہیں ہے، میں صبح اٹھ کر آٹا گوندھتا ہوں۔ پھر تھوڑی دیر انتظار کرتا ہوں جب اس کا خمیر اٹھ جاتا ہے تو گھر والوں کے لیے روٹی پکا لیتا ہوں اور پھر وضو کر کے باہر نکل آتا ہوں۔''

حضرت عمرؓ نے حمص والوں سے کہا: ''دوسری شکایت کیا ہے؟''

انہوں نے کہا: ''رات کو یہ کسی کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔''

میں نے کہا: ''سعید! اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

انہوں نے کہا: ''خدا کی قسم! میں یہ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن اب بتانا ضروری ہو گیا۔ میں نے دن کا وقت عوام کے لیے مختص کیا ہے اور رات کو اللہ کیلئے خاص کر دیا ہے۔

عمرؓ نے کہا: ''تیسری شکایت کیا ہے؟''

انہوں نے کہا: ''وہ یہ کہ سعیدؓ مہینے میں ایک دن گھر سے نکلتے ہی نہیں۔''

عمرؓ کہتے ہیں: ''میں نے کہا سعید! اس کی کیا وجہ ہے؟''

انہوں نے کہا: ''میرا کوئی خادم نہیں اور میرے صرف یہی کپڑے ہیں جو میں نے پہن رکھے ہیں۔ میں مہینے میں ایک مرتبہ ان کو دھوتا ہوں اور پھر انتظار کرتا ہوں کہ یہ سوکھ جائیں تو میں دن کے آخری وقت میں گھر سے نکل پاتا ہوں۔''

حضرت عمرؓ نے کہا: ''چوتھی شکایت بتاؤ؟''

حمص والوں نے کہا: ''جب سے یہ ہمارے پاس آئے ہیں ان پر کبھی کبھی غشی طاری ہوتی ہے اور پھر یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں میں نے کہا: ''سعید! اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

انہوں نے کہا: میرے ایمان لانے سے پہلے جب خبیب بن عدیؓ کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اس وقت میں موجود تھا۔ قریش کے لوگ اس کا ایک ایک عضو کاٹ کر کہتے: کیا تم چاہتے ہو کہ یہاں تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ سزا ملے؟ وہ جواب دیتے: خدا کی قسم! میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنے گھر میں آرام سے رہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے۔ یہ واقعہ جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ میں نے اس کی مدد کیوں نہ کی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت نہیں کرے گا۔ تو مجھ پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ سعیدؓ کے بارے میں ان کی رائے غلط نہیں نکلی۔ ایسے ہوتے ہیں لوگ! آج جو لوگ سعید بن عامرؓ کے مقام پر فائز ہیں وہ جب کسی کام کے ذمہ دار بنائے جاتے ہیں تو کیا ان کا کردار وہی ہوتا ہے جو سعید بن عامرؓ کا تھا؟

(ترجمہ: گل زادہ شیر پاؤ)

☆......☆......☆

غزل

مریم شفیق۔کراچی

وحشتِ دل کا کریں کیا یہ بتا دے کوئی
کتنی تاریکی ہے اک دیپ جلا دے کوئی
کسی بے نام سی منزل کی مسافر ہوں میں
میری منزل کا نشاں مجھ کو بتا دے کوئی
کاش الفت نہ بکے زر کے بازاروں میں
سونے چاندی کی یہ دیوار گرا دے کوئی
میری آنکھوں سے بہت اشک بہے ہیں مولا!
اک ترے عدل کی زنجیر ہلا دے کوئی

☆......☆......☆

کاش صبر آجائے

شازیہ محمود۔گوجرہ

کل جب میرا بیٹا سکول سے آیا تو میں ٹیلی ویژن کے سامنے بہت دکھی اور پریشان بیٹھی تھی۔ بولا ماما آپ کیوں رو رہی ہیں؟

بیٹا! اگر آپ کو سکول میں کچھ ہو جائے تو میری کیا حالت ہو گی! دیکھو یہ مائیں اپنے پیاروں کیلئے تڑپ رہی ہیں۔ ایسے ہی انہوں نے اپنے پیارے بچوں کو تیار کر کے بھیجا تھا۔ ظالم لوگوں نے کس سفاکی سے خون کی ہولی کھیلی ہے۔''

روتے روتے میری سسکیوں کی آواز پہ بیٹا اٹھا اور میرے آنسو پونچھنے لگا۔ ''ماما یہ کونسا سکول ہے؟''

''آرمی پبلک سکول پشاور'' اور یہ کہتے ہی بہت سی یادوں نے مجھے گھیر لیا جن دنوں ہم بچوں کے پاپا کی رسالپور پوسٹنگ پہ تھے۔

وہاں رسالپور میں میری بہت اچھی دوست سے اکثر میں نے آرمی پبلک سکول پشاور کا نام سنا تھا۔ ان کی خالہ ڈاکٹر اور میاں آرمی میں کرنل تھے ان کے بچے اسی سکول میں پڑھتے تھے۔ بتاتی تھی کہ اس کے دو بہن بھائی بھی اس سکول سے پڑھے ہیں۔ بہت مشکل سے اس سکول کا ٹیسٹ پاس ہوتا ہے۔ نہایت اچھا ادارہ ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ڈسپلن، صفائی، کردار اور شخصیت کی صحیح معنوں میں تربیت کرتے ہیں۔ وہ بہت فخر سے نام لیتی تھی کہ آرمی پبلک سکول سے پڑھنے والی میری بہن میڈیکل میں داخل ہو چکی ہے۔ وہاں سے فارغ التحصیل طلبہ زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر کے اس ملک وقوم کی تعمیر میں اپنا بیش بہا حصہ ڈالتے ہیں۔

آج دل غم سے نڈھال ہو رہا ہے وہ والدین آج کیسے اپنے ہاتھوں سے اپنے بڑھاپے کا سہارا بننے والے خوبصورت بچوں کو مٹی تلے دبا آئیں گے۔ وہ اتنا حوصلہ کہاں سے لائیں گے کہ زندگی کی دوڑ کو جاری رکھ سکیں۔ اے اللہ تو ہی ان کو صبر عطا کرنا۔ جتنا زیادہ صدمہ ہے والدین کو اتنا ہی صبر اور اس کے بدلے اجر عظیم عطا کرنا۔ (آمین)

ہماری قوم اپنے فرائض کو احسن طریقے سے ادا کرنے میں ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ ایک عام شخص سے لے کر وزیر مملکت تک ہم ہر چیز میں ناکامی کیلئے بہت خوبصورت جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ جب ضرب عضب چل رہا تھا تو ردِعمل کی توقع تو کی جا سکتی تھی اور اس کے پیشِ نظر اہم اداروں کی سکیورٹی انتہائی سخت ہونی چاہیے تھی۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اور ان کے کارکنان دھرنوں کی مہم جاری رکھے ہوئے تھے۔ سارے ملک کو درست کرنے والے اپنے علاقے کی حفاظت نہ کر سکے۔ پنجاب کی تمام تر پولیس وی آئی پیز اور دھرنوں کی حفاظت پر لگوا دی گئی تو اداروں کی حفاظت کون کرے گا۔ اب پوری قوم کو فوج کا ساتھ دے کر ان کے حوصلے بلند کرنے ہیں ملکی حالات کو تمام سیاستدان سنبھالیں، مل

بیٹھ کر اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے ملکی اور بیرونی جارحیت کا مقابلہ کریں۔

☆......☆......☆

باادب بانصیب بےادب بےنصیب

محمودہ شروانی۔ کراچی

کل رات کی ہلکی ہلکی بارش میں موسم بہت خوبصورت ہو گیا تھا ہر چیز میں نکھار خوبصورتی پیدا ہو گئی تھی۔ لان میں لگ رہا تھا جیسے پودے دُھل گئے ہیں۔ اللہ کی قدرت پر بہت پیار آ رہا تھا کتنے خوبصورت انداز ہیں میرے رب کے سب ہی بارش کیلئے ترس رہے تھے۔ میرا رب بہت مہربان ہے آج صبح صبح اس نے لان میں دو چار چکر لگائے اور آکسیجن کو اپنے اندر جذب کیا۔ زندگی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایک تازگی کا احساس تھا۔ مگر دل سوگوار تھا۔ بجھا بجھا سا۔ افسوس اور دُکھ جیسے بھرا ہوا ہو۔ قلم مضطرب تھا۔ مگر نجانے کیا رکاوٹ آ جاتی کہ روزانہ سوچا جاتا کہ دن میں دو گھنٹے تو ضرور دوں گی۔ دل کی چبھن کو الفاظ کے ذریعے صفحے پر منتقل کرنے کیلئے اخبار پڑھ کے دل اور پریشان ہو جاتا اچھی خبر تو کہیں نظر ہی نہیں آتی ملک کا یہ حال کہ جیسے جس گھر کے اماں ابا چلے جائیں تو ہر کوئی چاہتا ہے کہ اپنا فائدہ ڈھونڈے۔ اللہ تعالیٰ سرپرستی عطا کر اپنی پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو امت کے غم میں رات رات بھر اللہ کے سامنے آہ وزاری کرتے جنہوں نے اپنی ذات کیلئے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ ہاں دین پر کوئی آواز اُٹھی تو چہرہ غصے کی شدت سے سُرخ ہو جاتا اور بھرپور دفاع کیا جاتا۔

لوگ اپنے دل کی جلن کو کِس کِس طرح سے نکالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا نبیؐ اتنا محبوب کہ قرآن پاک اور نبیوں کو ان کے نام سے پکارا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "یاایھا النبی کہہ کر پکارا۔ اللہ نے اپنے محبوب کا احترام ملحوظ رکھا۔ ہم سب پر بھی لازم ہے امت مسلمہ کی فکر میں گھلنے والے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام کریں اور اپنا اپنا احتجاج تمام مسلم ممالک قلمبند کروائیں۔ اسلام امن و شانتی کا مذہب ہے۔ آپ دوسروں کے مذہب پر حملہ نہیں کرو برا بھلا نہ کہو مذاق نہ اڑاؤ کہ وہ جواب میں تمہارے لئے برا کہے۔ اور کہاں یہ گستاخانہ خاکے (نعوذ باللہ) بنانا۔ آزادی رائے ہونی چاہیے مگر دوسروں کا احترام دوسروں کے مذہب کی بزرگ ہستیوں کا احترام ہم سب پر لازم ہے۔ تعلیم یہی سکھاتی ہے۔ اسلام، امن، محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے۔ باادب بانصیب، بےادب بےنصیب!

☆......☆......☆

معیارِ محبت

مسز نورین فاطمہ۔ مظفر گڑھ

ختم الرسل آقائے دو جہاں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یوم ولادت و وفات 12 ربیع الاوّل ہے پہلے سے زیادہ جوش و جذبہ عقیدت، محبت لیے اپنی تمام تر رعنائیوں اور رونقوں کے ساتھ گزر گیا۔ امت مسلمہ کے ہر گھر سے چاول، حلوے دیگر سامان تقسیم ہوتا رہا تو رات کو چراغاں نے تمام شہروں کو روشنیوں سے نہلا دیا۔ رات کو میاں صاحب نے آفر کی کہ تمہیں چراغاں دکھا کر لاتا ہوں۔ تو گھر کے تمام بچے بھی ساتھ ہو لئے۔ نبیؐ محترم سے عاشقانہ محبت کا اظہار ہر سال سے بڑھ کر نظر آیا۔ لوگوں نے جگہ جگہ بازاروں میں خانہ کعبہ شریف، روضۂ اطہر، روضۂ امام حسینؓ، فوارے مختلف طرح کی ڈیکوریشن پیسز جن میں مختلف جانور جیسے بھالو، ٹیڈی بیئر، کتے اور مصنوعی انسان بنا رکھے تھے۔ بازاروں کے ساتھ ساتھ گھروں میں بھی مختلف رنگوں سے رنگولی بنا رکھی تھی۔ جو آج سے پہلے میں نے صرف انڈیا کے ڈراموں میں ان کے کسی ہندوانہ تہوار کے موقع پر بناتے ہوئے دیکھا تھا۔ بچے سجاوٹ دیکھنے میں مصروف تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ خانہ کعبہ تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ جس کی حدود میں شیطان کا داخلہ ممنوع ہے۔ نہ صرف شیطان بلکہ دجال بھی دنیا کے تمام شہروں میں داخل ہوگا۔ مگر مکہ اور مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ خانہ کعبہ کے ایک کونے میں نصب حجرِ اسود دنیا میں جنت کی نشانی ہے۔ روضہ رسولؐ جہاں ساتھ ہی ریاض الجنۃ بھی ہے کیا دنیا میں اس کی مثل کوئی اور جگہ موجود ہے۔ اگر ہے تو پھر زندگی بھر درِ نبیؐ

پر حاضری کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں کیوں موجود رہتی ہے۔ ہر صاحب حیثیت پر تو اللہ حج فرض کر کے خانہ کعبہ اور مدینہ شریف کی زیارت کا اہتمام کروا دیا۔مگر جو صاحب حیثیت نہیں ہوتے انہیں بھی تین جگہوں خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی زیارت کا شوق رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔مگر اُمت نے اپنے لیے آسانی ڈھونڈ لی اوران زیارت گاہوں کے ماڈل یہیں بنانے لگے کہ شاید یہ محبت کی نشانی ہے۔ہم یہ بھول گئے کہ محبت کا اصل معیار اطاعت میں ہے۔

☆......☆......☆

ایکول ایکول

صائمہ عبدالواحد۔کراچی

بات ذرا اس ٹی وی پر چلتے اشتہار سے شروع کرتے ہیں جس میں کہا جا رہا ہے ’’Perfect couple equal equal ہے نا‘‘ شاید جو ٹی وی تھوڑا بہت بھی دیکھتے ہوں گے تو وہ سمجھ گئے ہوں آج اس equal کی تشریح ایک جیسے یعنی Sinilar کے معنوں میں کی گئی ہے۔حالانکہ یہ بات نظام فطرت کے خلاف ہے اور بچوں کو گمراہ کرتی ہے۔couple یعنی جوڑے کے اندر بات equal equal یعنی ایک جیسی ہو ہی نہیں سکتی۔قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ جنہیں جوڑے قرار دیتا ہے جیسے زمین آسمان، چاند سورج، دن رات اور مرد عورت کہ ایک کے اندر جو خاصیت ہے وہ دوسرے کے اندر نہیں اور دوسرے کے اندر جو خوبی ہے وہ پہلے میں نہیں۔اللہ اسی کو جوڑ قرار دیتا ہے۔اگر اس کی مثال مرد عورت سے لی جائے تو عورت کے اندر جو برداشت کی قوت ودیعت کی گئی ہے وہ مرد کے اندر نہیں اور مرد کے پاس جو ہمت، شجاعت اور خاندان کا بار اٹھانے کی اہلیت ہے وہ عورت میں کہاں۔گھر کے اندرونی معاملات اور بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال جس طرح عورت سرانجام دے سکتی ہے اس طرح مرد نہیں کرسکتا اور مرد جس طرح کسب معاش کے لئے دوڑ دھوپ کرسکتا ہے۔ویسے عورت کیلئے کرنا ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ایک فطرت پر پیدا کیا ہے اور دجالی دنیا اس فطرت کو بدل دینے پر تلی ہوئی ہے۔فطرت کے مطابق عورت کو مرد کے برابر معاشی دوڑ میں شامل کرنے سے مغربی معاشرے کی کیا ترقی حاصل کر لی؟ جس معاشرے میں ماں بہن اور بیٹی جیسے مقدس رشتے سے عورت پہچانی ہی نہ جاتی ہو، جس معاشرے میں عورت روپیہ کمانے کا ایک کل پرزہ بنی ہو چاہے اپنے حسن کے ذریعے سے ہو یا کوئی اور ذریعہ اختیار کرے......اسی معاشرے کی نقالی ہم کر رہے ہیں۔

ہمیں اس بات پر ضرور سوچنا ہوگا کہ آیا ہم اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلوا کر اس معاشرے میں کسب معاش کے لئے دھکے کھانے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں مغربی معاشرے کی طرح اپنے گھروں اور خاندانوں کا شیرازہ بکھیرنا چاہتے ہیں یا پھر اپن بیٹیوں کو محاذ سنبھال کر اپنی اگلی نسل کی بہتر تربیت کیلئے ابھارنا چاہتے ہیں؟

☆......☆......☆

اپنا فسانہ بھول گئے

خورشید بیگم۔گوجرہ

ستمبر 1971ء میں شائع ہونے والے خدام الدین کے شمارے میں غلام انور صابری کی یہ نظم ’’خود فراموشی‘‘ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ دورِ حاضر کے مسلمانوں پر عین صادق آتی ہے۔

جس دور پہ نازاں تھی دنیا ہم اب وہ زمانہ بھول گئے
دنیا کی کہانی یاد رہی اور اپنا فسانہ بھول گئے
وہ ذکرِ حسیں، رحمت کا امیں کہتے ہیں جسے قرآن مبیں
دنیا کے نئے نغمے سیکھے عقبیٰ کا ترانہ بھول گئے
اغیار کا جادو چل بھی چکا ہم ایک تماشا بن بھی گئے
عبرت کا مرقع یہ پستی ہے قابلِ حیرت یہ مستی
اپنا تو مٹانا یاد رہا باطل کا مٹانا بھول گئے
انجامِ آزادی کیا کہئے بربادی سی بربادی ہے
جو درس شہہ بطحاؐ نے دیا دنیا کو پڑھانا بھول گئے
تکبیر تو اب بھی ہوتی ہے مسجد کی فضا میں اے انورؔ
جس ضرب سے دل ہل جاتے تھے وہ ضرب لگانا بھول گئے

وطن میرا لہو رنگ ہے

ذکیہ فرحت۔کراچی

ہمارا وطن یہ ہمارا وطن
ہمیں سب سے بڑھ کر ہے پیارا وطن

دفاعِ وطن ہے فریضہ مرا
جہاد وطن ہے طریقہ مرا

اسے جان و دل سے سنواریں گے ہم
یہ چہرہ وطن کا نکھاریں گے ہم

بہے قطرۂ خون اسی راہ میں
لگیں قوتیں بھی اسی چاہ میں

ہیں جس میں بزرگوں کی قربانیاں
جہاں پر ہیں سجدوں میں پیشانیاں

وطن آج میرا لہو رنگ ہے
یہاں عرصۂ زندگی تنگ ہے

مگر میرا قائم ہے عزم جواں
ہے خوں بھی رگوں میں رواں و دواں

☆......☆......☆

خوبصورتی کے راز

خالدہ آفتاب۔ماڈل ٹاؤن، کراچی

فیشل ماسک:

اجزاء:

جو کا آٹا	2 چمچ
ہلدی	آدھا چمچ
کھیرے کا گودا	آدھا چمچ
ٹماٹر کا گودا	آدھا چمچ
دہی	دو چمچ

ترکیب:۔

ان سب چیزوں کو گرائنڈ کر کے اس ماسک کو چہرے پر لگائیں 20 منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں ان سب چیزوں کو ڈبل کر کے 4 دن کیلئے بوتل میں رکھ کر استعمال کریں۔ بوتل فرج میں رکھیں۔ بہتر ہے کہ تازہ استعمال کریں۔

رات کو سونے سے پہلے کچا دودھ چہرے پر لگا کر سو جائیں صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں چہرہ چمک اُٹھے گا۔

زیادہ خیال اس بات کا رکھیں کہ پانی زیادہ سے زیادہ پینا ہے۔ نماز کی پابندی کریں۔ خود بھی خوش رہیں اوروں کو بھی خوش رکھیں اچھی کتابیں پڑھیں۔ بھرپور نیند لیں۔

☆......☆......☆

ہماری حالت کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا، والی ہے۔ مغرب کی تقلید میں اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ ہر وہ کام کرنا ہے جو انگریز کر رہا ہے، چاہے وہ ہمارے دین اور معاشرتی اقدار کو تار تار کر دے۔ آج سے دو دن کے بعد 14 فروری کو نجانے کتنی تعداد میں، مغربی تہذیب کے دیوانے یہاں ویلنٹائن ڈے منانے کے لیے اسلام کے بنیادی شعار شرم و حیا کے برخلاف اپنے آپ کو ماڈرن اور روشن خیال ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ دو دن قبل میں نے مری میں واقع ایک اہم ہوٹل فون کیا تو معلوم ہوا کہ ویلنٹائنز ڈے کی وجہ سے ہوٹل مکمل بک ہے اور ویک اینڈ کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اس موقع پر سرخ پھولوں، سرخ ریپرز میں لپٹے چاکلیٹس و دیگر تحفوں اور شراب کا کاروبار خوف چمکتا ہے۔ عمومی طور پر ایسے بے ہودہ مغربی رواجوں پر اعتراض کرنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ بھئی آپ کو کیا اعتراض اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کو پھول پیش کر دے اور محبت کا اظہار کرے، یہاں پاکستان میں تو ویسے ہی خوشیاں منانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ اس بے ہودگی کے حق میں کچھ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ ہرج کیا ہے اگر کوئی ایسا کر لے۔ اس تہوار کے وکیل تو اپنے آپ کو ٹھیک ثابت کرنے کیلئے سرخ پھول اور آئی لو یو کو والدین، بہن بھائیوں، بیوی بچوں کے ساتھ محبت سے جوڑنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں جا کر دیکھیں کتنے لوگ اپنے ماں باپ کو اس موقع پر ویلنٹائنز ڈے منانے کیلئے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اپنے اپنے شہروں کی اہم مارکیٹوں میں جا کر دیکھیں کہ ویلنٹائنز ڈے کے موقع پر کتنے بھائی اپنی بہنوں کے ساتھ وہاں اس مغربی تہوار کو منانے کیلئے موجود ہوتے ہیں۔ چاہے دلیل جو مرضی ہو، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تہوار کے حق میں بولنے والے کیا یہ برداشت کریں گے کہ ان کی بیٹیوں اور بہنوں کو بازاروں میں، ہوٹلوں میں یا محلے میں سے گزرتے کوئی لچا، لفنگا، لوفر سرخ پھول تھما دے اور آئی لو یو کہے۔ ایسے میں وہ کیا کہیں گے کہ آخر حرج ہی کیا ہے۔ دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کے لیے تو ہمارے معیار ہی مختلف ہوتے ہیں۔ ان کو پھول پیش کریں، اظہار محبت کریں، ان کی زندگیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں کوئی مسئلہ نہیں مگر جب اپنی بہن اور بیٹی کا مسئلہ ہو تو غیرت جاگ اٹھتی ہے۔ ہاں اگرچہ یہاں ایک محدود طبقہ ایسا ضرور ہے جن پر مغربی تہذیب کی بے شرمی کا رنگ اس قدر خوب چڑھ چکا ہے کہ ان کیلئے عزت غیرت اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ مگر اس تہوار کو منانے والوں کی بڑی تعداد اپنے لیے وہ پسند نہیں کریں گے جو وہ دوسروں کی بہنوں بیٹیوں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں اکثریت کی خاموشی اور حکومتوں کی نااہلی کی وجہ سے بے ہودگی کا یہ کاروبار اس حد تک فروغ پا چکا ہے کہ اخبارات میں ویلنٹائنز ڈے کے لیے اشتہار دیئے جاتے ہیں مگر کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چند دن قبل ایک اخباری اشتہار سوشل میڈیا میں پڑھنے کو ملا جس کا عنوان ''لڑکے لڑکیوں سے دوستی'' تھا اور جس کے مضمون میں یہ لکھا تھا ''ہزاروں پاکستانی ماڈرن حسین لڑکے لڑکیوں سے دوستی، تصویریں، موبائل نمبر، ویلنٹائنز پارٹنر حاصل کریں اور ان لمحات کو خوشگوار بنائیں۔'' اشتہار دینے والی خاتون نے اپنا نام مس صائمہ ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ موبائل نمبر بھی دیا۔ یعنی بغیر کسی لگی لپٹی، کس دیدہ دلیری کے ساتھ جوان مردوں اور عورتوں کو کھلے عام گناہ کی دعوت دی جاتی ہے اور اخبار یہ اشتہارات بلا سوچے سمجھے شائع بھی کرتے ہیں۔ اور جب یہ اشتہارات شائع ہوتے ہیں تو کسی کو بولنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس قسم کے دھندے کو مسلمانوں کے معاشرے میں کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا مگر ہم بحیثیت

قوم کچھ ایسے بے حس ہو چکے کہ یہاں جو مرضی ہو جائے ہم نے بولنا ہے اور نہ ہی احتجاج کرنا ہے۔ ورنہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایسے غلیظ اشتہارات پڑھ کر نجانے ہمارے کتنے بچے بے راہ روی کے لیے بچھائے گئے اس جال میں پھنستے ہوں گے۔ نجانے ہم میں سے کتنوں کو خبر بھی نہ ہو گی مگر ہمارے بچے اور بچیاں اس بیہودہ تہوار کے نام پر اپنی زندگیاں تباہ کر رہے ہوں گے۔ ان حالات میں حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی بے ہودگیوں کو ہوٹلوں، بازاروں اور میڈیا کے ذریعے معاشرے میں پھیلنے سے سختی سے روکنے کے اقدامات کرے۔ لیکن ہماری حکومتیں تو اپنی اس ذمہ داری سے مکمل غافل ہیں اور اس کی مثال یہ ہے کہ کتنے سالوں سے ویلنٹائنز ڈے یہاں منایا جاتا ہے مگر نہ کبھی میڈیا کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی نہ ہی بڑے بڑے ہوٹلوں پر چھاپے مارے گئے اور نہ ہی مس صائمہ جیسے کرداروں کو گرفتار کر کے سزا دی گئی۔ اس کام کیلئے بڑے شہروں کی مخصوص مارکیٹوں میں بھی لڑکے لڑکیوں کو کھلی چھٹی دی جاتی ہے کہ جیسے چاہیں انجوائے کر لیں۔ حکومت کے ساتھ ساتھ سیاسی پارٹیاں، پارلیمنٹ، عدلیہ اور عمومی طور پر معاشرے نے بھی ایسے تہواروں کو روکنے کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھایا، کوئی حکم صادر نہیں کیا اور نہ ہی قانون سازی کی۔ صرف جماعت اسلامی کی خواتین کی طرف سے اس موقع پر ہر سال کچھ نہ کچھ کام کیا جاتا ہے وگرنہ عمومی طور پر ہم سب اس جرم میں اپنی خاموشی کی وجہ سے برابر کے شریک ہیں۔ ہم میں سے بہت سے سوچتے ہوں گے کہ چلیں کوئی مسئلہ نہیں، کون سا میرے بچے اس تہوار کو منا رہے ہیں مگر کسے خبر وہ چھپ کر ایسا کر بھی رہے ہوں۔ اگر آج نہیں تو کل، کیا وہ یا ان کے بچے ایسا نہیں کریں گے۔ ایسے میں، ہم میں سے ہر ایک کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے سراسر خلاف ایسے مغربی تہواروں کی کھلے عام مذمت بھی کریں اور ہر وہ پرامن طریقہ اپنائیں جس سے پاکستان کے معاشرہ کو ایسی بے ہودگیوں سے پاک کیا جا سکے اور جس کے ذریعے مغربی تہذیب کی خرافات کے سنگین نتائج سے معاشرہ کو آگاہی حاصل ہو سکے۔

☆......☆......☆

ام ارقم

انگوٹھا چوسنا

کچھ عادات بچوں میں عام ہوتی ہیں لیکن ہم بچے کی عادت سمجھ کر زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ عادات پختہ ہو جاتی ہیں اور بچے کی شخصیت پر اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً:

انگوٹھا چوسنا:

بہت چھوٹے بچوں میں یہ عادت عام طور پر دیکھی جاتی ہے۔ کچھ بچے ہوش سنبھالنے کے ساتھ اس عادت پر قابو پا لیتے ہیں کچھ بچے بڑے ہو کر بھی یہ عادت نہیں چھوڑتے۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ گود کے بچے کا انگوٹھا چوسنا قدرتی امر ہے۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں، وقت گزرنے کے ساتھ بچہ یہ عادت ترک کر دیتا ہے لیکن اگر زبردستی چھڑانے کی کوشش کی جائے تو تو بچے پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔

جب کوئی بچہ انگوٹھا چوستا ہے تو وہ اپنے ہونٹوں کو انگوٹھے پر چاروں طرف سے کس لیتا ہے اور اس کی زبان، تالو، ہونٹ، گال، اس عمل میں لگاتار حرکت کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر بچے ہتھیلی والا حصہ تالو کی طرف اوپر رکھتے ہیں اور بعض بچے انگوٹھا چوسنے کے دوران اپنے دوسرے ہاتھ سے بال یا کان کو پکڑتے یا سہلاتے ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ اور اس کے ہم خیال ماہرین نفسیات کے نزدیک بچے کا انگوٹھا چوسنا اس بات کی دلیل ہے کہ بچہ ماں کا دودھ پینے کے دوران ایک خاص لذت محسوس کرتا ہے اگر اس کو بوتل کے دودھ پر لگا دیا جائے تو بوتل کے دودھ سے اس کا پیٹ جلد بھر جاتا ہے اور چوسنے والی خواہش تشنہ ہی رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ انگوٹھا چوسنے کی عادت کا شکار ہو جاتا ہے۔

جب بچے کا دودھ چھڑایا جاتا ہے تو اس کو نہ بوتل ملتی ہے نہ ماں کا دودھ لیکن چوسنے کی عادت یا خواہش اس کے دل میں ہوتی ہے۔ ماہرین کے مطابق بچہ یہ عادت اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ بور ہو رہا ہو یا تھکا ہوا ہو یا سونے کی تیاری کر رہا ہو۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ انگوٹھا چوسنے والا بچہ شدید الجھن کا شکار ہوتا ہے، اس میں خود اعتمادی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ انگلیاں چٹخانا، دانتوں سے ناخن کاٹنا، یہ عادتیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں جن کا بڑی عمر تک شکار رہنا شخصیت کو متاثر کرتا ہے۔

انگوٹھا چوسنے کے مُضر اثرات:

☆ بچے مختلف قسم کے Infection کا شکار رہتے ہیں

☆ جبڑے کی ہڈی کی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے۔

☆ دانت ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔

☆ سانس لینے اور چبانے کے عمل میں دشواری۔

☆ چہرے کی بناوٹ میں خرابی

☆ بچہ بڑے ہو کر اس عادت کو کسی اور عادت سے منتقی کر لیتا ہے۔ مثلاً سگریٹ نوشی۔

☆ بے تحاشا ٹافیاں اور چیونگم کھانا۔

اس عادت کو کیسے ختم کیا جائے؟

☆ یہ عادت ختم کرنے میں والدین اور بہن بھائیوں کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔

☆ والدین اپنے بچے سے نرمی اور شفقت سے پیش آئیں اور اس کا خیال رکھیں۔

☆ بچے کے منہ سے زبردستی انگوٹھا مت نکالیں۔

☆ سب بہن بھائیوں میں عدل اور انصاف کریں۔

☆ بچے کو احساس دلائیں کہ وہ ان کے لیے کتنا اہم ہے۔

☆ مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں اس سے بچے میں یہ بیماری پیدا نہیں ہوگی۔ انشاءاللہ

☆......☆......☆

وہ بھاری کلام

آج قرآن پاک کی تلاوت کرنا کتنا آسان لگتا ہے۔ثواب کا تصور اور بھی آسان کر دیتا ہے کہ ہر حرف پہ دس نیکیوں کا بینک بیلنس بڑھتا جاتا ہے۔سیپاروں پہ سیپارے ختم کرتے جاتے ہیں۔قرآن کے ختم کی گنتی شمار میں بڑھتی جاتی ہے۔مگر قلب وذہن پر قرآن کی عظمت و شان اور اس کے جلال کا کوئی احساس طاری نہیں ہوتا۔اس کریم ورحیم ذات کے کلام کی کوئی حلاوت دلوں میں مٹھاس نہیں اتارتی اور نہ ہی قہار وجبار ذات کا جلال اس کے کلام کے ذریعے کوئی ادراک لاتا ہے۔نہ آنکھ میں آنسو نہ دل میں رقت نہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں...... ایمان کی کون سی قسم ہے جس کے ساتھ ہم قرآن پاک سے تعلق جوڑتے ہیں؟ حالانکہ یہ وہ کلام ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

''اگر ہم نے یہ قرآن پہاڑ پر بھی نازل کیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے پھٹا پڑتا ہے۔''(الحشر ۲۰:۵۹)

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بھاری ذمہ داری سونپنے کی بابت فرمایا کہ:

انا سنلقی الیک قولا ثقیلا (سورۃ المزمل ۵)

''ہم عنقریب آپ پر ایک ثقیل اور گراں بار کلام نازل کریں گے۔''

''قولِ ثقیل'' کے نزول کی ظاہری کیفیت پہ غور کیا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔وحی نازل ہونے کی عظمت اور جلال کا سوچ کر دل پہ ہیبت طاری ہونے لگتی ہے۔

کبھی ہم نے سوچا کہ وہ قلب محمدؐ پہ نازل ہونے والا کلام کیسا ''قولِ ثقیل'' تھا......؟ تصور میں سخت سردی کے موسم میں حضور اکرمؐ کی پیشانی مبارک سے پسینے کی کثرت......اور وہ اونٹنی کی حالت زار، کہ توانا، صحت مند، مضبوط اونٹنی بوجھ کے احساس سے کانپتی ٹانگوں اور شدت و کرب کی کیفیت میں زمین سے لگ جاتی ہے......صرف ایک آیت نازل ہونے پہ یہ کیفیت ہے جب لمبی سورتوں کا بیک وقت نزول ہوا ہوگا تو کیا کیفیات ہوتی ہوں گی؟

اے قرآن کے قاری! ''قولِ ثقیل'' کو آسانی اور روانی سے ادا کر لینے والے وقت میں نزول کی کیفیات کا ادراک بھی طاری کر لیا کرو...... تو شاید یہ کلام حلق سے نیچے اتر کر دل پہ دستک دینے لگے......

نزول وحی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب وروح اور جسم مبارک پر کیا گزرتی تھی......کاتب وحی زید ابن ثابتؓ کو اس کا تجربہ ہوا کہ دونوں محفل میں قریب قریب نشست فرما تھے۔اس طرح کہ حضورؐ کا گھٹنا مبارک زیدؓ بن ثابت کے گھٹنے پہ آیا ہوا تھا۔اللہ کے آخری نبیؐ پہ وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔زیدؓ بن ثابت کو ایسا محسوس ہوا جیسے احد پہاڑ ان کے گھٹنے پہ رکھ دیا گیا ہے۔چند لمحے میں ان کو لگا کہ ان کا گھٹنا چور چور ہو جائے گا۔ساتھ والے کا یہ حال ہے تو جس پہ وحی نازل ہو رہی ہو اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ وحی کی کیفیت کتنی دیر تھی؟......صرف تین لفظ نازل ہوئے تھے۔جو دراصل ایک ہی تھا۔......وہ سورۃ النساء کی ایک آیت میں 'غیر اولی الضرر' کا اضافہ کرنا تھا......اس ایک لفظ کے نازل ہونے میں چند لمحے درکار تھے اور اتنا ہی وقت صرف ہوا......مگر 'قولِ ثقیل' سے انسان کتنا زیر بار اور دبا جاتا ہے......تو بات سمجھ آتی ہے کہ قرآن اگر کسی پہاڑ پہ نازل کیا جاتا تو مارے خوف وخشیت کے پھٹ جاتا......

مگر آج ہم اپنے دلوں کا جائزہ لیں، اپنے اندازِ قرأت، احساسِ

ذمہ داری پہ غور کریں، فہم وشعور پر نظر ڈالیں۔ پوری امت کے حالات کو سامنے رکھیں ......ایک ہی جواب ہے کہ قرآن زبانوں پہ ہے......دل میں نہیں ......دل کی بہار نہیں۔ حالانکہ دلوں میں بہار صرف کلامِ الٰہی سے آ سکتی ہے اور دل میں اترے گا تو پھر عمل بھی آئے گا۔ امام غزالی ''احیاءالعلوم'' میں کسی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے کہا:

''میں نے قرآن کی تلاوت کی تو مجھے دل میں مٹھاس محسوس نہ ہوئی۔ پھر میں نے تصور کیا کہ جیسے حضور اکرمؐ صحابہ کرامؓ کو قرآن سنا رہے ہیں اور میں صحابہ کی محفل میں بیٹھا ہوں۔

پھر میں نے اپنے تصور کو اور ترقی دی اور محسوس کیا کہ جیسے جبرئیلؑ قرآن سنا رہے ہیں اور حضورؐ سن رہے ہیں میں بھی ساتھ ہی سن رہا ہوں ......کلام کی حلاوت نے میرے دل کو نور سے بھر دیا......تو میں نے اپنے تصور کو آگے بڑھایا اور میں نے محسوس کیا کہ جس رب کا کلام ہے وہ مجھ سے خود مخاطب ہے......''

علامہ اقبالؒ کے والد نے بھی یہی احساس بیٹے کے دل میں ڈالا ......اور پھر قرآن ان کے ہر شعر میں اس طرح زندہ ہو گیا کہ جیسے قرآن نازل کرنے والے نے خود ہر شعر ان کے دل پہ اتار دیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کو براہ راست اپنے دل میں نفوذ کرنے کی بابت، نیت، کوشش، استقامت اور ارتقاء جذب و کیف کے لیے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔

''اے اللہ رب العزت! قرآن عظیم کو ہمارے دل کی بہار، آنکھوں کا نور، غم کا ازالہ، فکر دور کرنے کا سبب بنا دے، (وہ غم اور فکریں انفرادی ہوں یا اجتماعی اور ساری امت مسلمہ کے ہر فرد کو حامل قرآن اور عامل قرآن بنا دے۔ آمین)

☆......☆......☆